ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں کا سماجی مطالعہ

مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (اردو)

(فیکلٹی آف آرٹس)

سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ

از

پٹھان عالیہ کوثر علی شاہ خان

صدر شعبہ اردو

راشٹر ماتا اندرا گاندھی مہاودیالیہ، جالنہ

زیر نگرانی

ڈاکٹر حمید اللہ خان

ریسرچ سینٹر گیان اپاسک کالج، پربھنی

DEPUTY NAZEER AHMED KI NAVELON KA SAMAJI MUTALA

SUBMITTED
For Award of Ph.D (Urdu)
Faculty of Arts

SWAMI RAMANAND TEERTH MARATHWADA UNIVERSITY, NANDED

By

PATHAN ALIYA KAUSER ALI SHAH KHAN
Head of Department, Urdu
Rashtra Mata Indira Gandhi Mahavidyalaya,
JALNA Dist. JALNA

Under The Guidance

DR. HAMEEDULLAH KHAN
Urdu Research Center
D.S.M College, Parbhani

CERTIFICATE

I, Certify that the thesis entitle **“DEPUTY NAZEER AHMED KE NAVELON KA SAMAJI MUTALA”** is an original and genuine piece of research work carried on by **Pathan Aliya Kauser Ali Shah Khan** under my Guidance & Supervision for the degree of Doctor of Philosophy of the Swami Ramanad Teerth Marathwada University, Nanded. For the Award of Ph.D. Degree in Urdu. The present work is of original nature to the best of my knowledge.

This piece of work has not been submitted for the award of any degree of any university.

Place :

Date :

Dr. Hameedullah Khan
Research Guide,
Urdu Research Center,
D.S.M College, Parbhani

پیش لفظ

ناول دراصل اطالوی زبان کے لفظ 'ناویلا' سے انگریزی میں آیا اور انگریزی کی توسّل سے اردو میں آیا۔ ناول کے معنی نئے کے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ناول قصہ نگاری کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔

اردو میں ناول نگاری کا آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد تسلیم کیا جاتا ہے۔ ڈپٹی نظیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی ناول 'مراۃ العُروس' اردو کی پہلی ناول کہلاتی ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں کی اہمیت وافادیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے مسائل اور حالات کو بہت باریک بینی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سے ہم اپنے ماضی کے ایک خاص حصے سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ نذیر احمد کے ناول اپنے دور کی مکمل تاریخ ہے۔ مولوی نذیر احمد کی تصانیف میں مراۃ العُروس، بنات النعش، توبتہ النصوح، ابن الوقت، رویائے صادقہ، فسانہء مبتلا اور ایامی شامل ہیں۔ ان ناولوں میں فنی اعتبار سے قصہ ہے، کردار ہے۔ مکالم نگاری اور منظر نگاری بھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اصلاحی پہلو اور فلسفہ حیات بھی ہے۔

نذیر احمد کے سامنے کوئی مربوط ناول کا فن نہیں تھا۔ وہ اپنے بچوں کو سماجی اقدار اور صالح معاشرے میں انسان کے اعلیٰ صفات کی اہمیت واضح کرنا چاہتے تھے۔

اوراسی لئے انھوں نے اپنے دور کے مسلم معاشرے اور سماج کے مسائل کو موضوع بنا کر قصّے لکھے۔

نذیر احمد کی ناولوں کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس دور میں مسلم معاشرہ انتہائی کسم پرسی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ اور اس حالت زار سے نکالنے والا کوئی رہبر نظر نہیں آ رہا تھا۔ سماجی معاشی اور سائنسی اعتبار سے مسلم معاشرہ زوال کا شکار تھا۔

ادب میں خاص طور سے شاعری میں عشق و معشوقی کے مضامین اور محبوب کے جسمانی قد و خال سے ایک رنگین دنیا آباد تھی۔ تو نثر میں داستانوی ادب جو حقیقت سے زیادہ تخیلات کی بلندی پرواز کا شکار تھا۔ لوگ حقیقی دنیا سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے مافوق الفطرت عناصر میں اپنے غم کا مداور تلاش کر رہے تھے۔

ڈپٹی نظیر احمد نے اس خیالی دنیا سے نکل کر مسلم سماج کے حقیقی مسائل پر توجہ مرکوز کی اور ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی بدلتی ہوئی معاشرتی زندگی کے لئے جو ضروری طریقہ کار تھا اسے اپنایا۔ اس لئے نذیر احمد کی ناولوں کا سماجی مطالعہ اہم ہو جاتا ہے۔

درج بالا باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے اپنے تخلیقی مقالہ کا عنوان 'ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں کا سماجی مطالعہ' تفویض کیا۔

یہ تحقیقی مقالہ درج ذیل ابواب پر منحصر ہے۔

باب اول:۔۔۔ادب وسماج کا رشتہ۔

چونکہ ادب معاشرے میں ہی وجود میں آتا ہے وہ اپنے اطراف واکناف کے بڑے مسائل سے گھرا رہتا ہے۔اورحساس ذہن کا تخلیق کار اپنے فن پارے کے لئے ایسے ہی خام مواد سے اپنی تخلیقی فن پارے کے خمیر کو اکٹھا کرتا ہے۔

ادب کا مفہوم ، ادب کی تعریف ، سماج کا مفہوم اور ادب کے رشتے جو ایکدوسرے پر ہمیشہ اثر انداز ہوتے ہیں اسی کے پیش نظر اس باب میں بحث کی گئی ہے۔

کوئی بھی فن پارہ اپنے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے اور سماج و ادب ایک دوسرے پر اثر انداز دکھائی دیتے ہیں۔ادب کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ ادب فکر و احساس اور اظہار کے تناسب کا نام ہے۔جو بات عام طریقوں سے ہٹ کر خوبصورت پیرائے اظہار بن جاتی ہے وہ ادب کہلاتا ہے۔یہ بھی سچ ہے کہ انسان کے فکر واحساس اس کے تجربات اور تاثرات ادبی تخلیق کے ترجمان ہوتے ہیں۔اس کا ایک نرالہ طرز اظہار اور ایک مخصوص اسلوب بھی ہوتا ہے۔سماج اور ادب ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کہے جاتے ہیں۔

ادب چونکہ معاشرے کا پروردہ ہوتا ہے۔ادیب کی شخصیت پر سماجی حالات، واقعات اور وسائل اثر انداز ہوتے ہیں۔اسی لئے ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں میں سماج

سماج کے جو مسائل آئے ہیں، جو ادبی شکل مرتب ہوئی ہے اسی سے بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب دوّم۔۔۔اردو ناول کا آغاز وارتقاء۔

باب دوم میں اردو ناول کے آغاز وارتقاء سے بحث کی گئی ہے۔ چونکہ ناول اردو کی ترقی یافتہ صنف ہے جس میں انسانی زندگی کی گوناگوں جھلکیاں نظر آتی ہے۔ساتھ ہی زندگی کے سچے واقعات کو بیان کیا جاتا ہے۔

ناول دراصل اطالوی زبان کے لفظ 'ناویلا' سے ماخوذ ہے۔انگریزی ادب نے اسے ناول کہا۔اور یہی لفظ اردو میں استعمال کیا جاتا ہے۔اردو ناول نگاری کا آغاز ڈپٹی نذیر کے ہاتھوں ہوا لیکن اس کی توسیع پنڈت رتن،عبدالحلیم شرر، راشدالخیری،منشی سجاد حسن اور محمد علی طیب نے ناول نگاری کو فوقیت بخشی۔اس کے بعد مرزا ہادی رسوا، پریم چند، سدرشن، قاضی عبدالغفار سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں تک پہنچا۔انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ناول کے فن کو مزید بلندیاں عطا کی۔جس میں سجاد ظہیر، عصمت چغتائی،عزیز احمد، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی،قراۃ العین حیدر شامل ہیں۔۱۹۴۷ء کے سانحہ پر کئی ناول نگاروں نے اپنے شاہکار ناول لکھے۔جس میں تفہیم سے پیدا شدہ ناول شامل ہیں۔خاص طور سے منجامن گیلانی، ابراہیم جلیس، کرشن چندر،مظہرالزماں وغیرہ ناول نگار شامل ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان کی اختصادی، سماجی، سیاسی اور فرقہ وارانہ ذہنیت پر کئی ناول لکھے گئے۔ان میں مظہرالزماں، فہمیدہ صاحبہ، الیاس احمد گدی، احمد صغیر، جوگیندر پال، اشرف عالم اور پیام آفقی شامل ہیں۔جو ناول نگاری کے ارتقاء اور توسیع کے ضامن ہیں۔اسی پس منظر میں ناول نگاری کے ارتقاء سے بحث کی گئی ہے۔

باب سوّم۔۔۔ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں کا تنقیدی جائزہ۔

باب سوم میں ڈپٹی نذیر احمد کا ناولوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔نذیر احمد نے کل سات ناول لکھے جس میں انھوں نے اصلاحی پہلو کو اوّلیت دی۔ان کی ناولوں میں مراۃ العُروس، بنات النعش، توبتہ النصوح، رویائے صادقہ، فسانہء مبتلا، ابن الوقت اور ایامی شامل ہیں۔ان تمام ناولوں میں نذیر احمد کے دور کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل بیان کیا گیا ہے۔اس باب میں نذیر احمد نے سماج میں پھیلی ہوئی خامیوں کو بیان کرنے کی کوشش کی۔اسی نکتہ نظر سے نذیر احمد کے ناولوں کا مطالعہ کیا گیا۔

باب چہارم۔۔۔ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں کا سماجی مطالعہ۔

باب چہارم دراصل ڈپٹی نذیر احمد کے زمانے میں سماجی حالات اور مسائل سے گھرا ہوا تھا۔مسلمانوں کی سوچ وفکر محدود ہوگئی تھی۔۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کا اقتدار چھن جانے کی وجہ سے احساس کمتری میں زندگی گزارر ہا تھا۔حاکم فوج محکوم بن گئی تھی غدر کے بعد مسلمانوں پر جوظلم کے پہاڑ توڑے گئے تھے اور ہر طرح سے انھیں کچلنے کی

کوشش کی جارہی تھی ۔تعلیم سے دوری ایک اہم مسئلہ بن گیا تھا۔طبقہ نسواں مختلف برائیوں کا شکار تھا۔ بے روزگاری اور بے حسی عام تھی ۔ دینی ودنیاوی مسائل پر فضول بحث اور مباحثے ہوتے ۔ ہر طرف مایوسی ، بے بسی اور قناعت پسندی عام تھی ۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں مذکورہ سماجی پس منظر میں بحث کی گئی ہے ۔

باب پنجم ۔۔۔ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں میں نسائی مسائل ۔

یہ باب پنجم دراصل نذیر احمد کے دور کے عورتوں کے مسائل پر مشتمل ہے ۔مسلم سماج میں خواتین کی جو حالت زار تھی ، عادات ،سنجیدگی اعلی طبقہ کی عورتوں سے مختلف تھی ۔ نذیر احمد مسلم عورتوں کی اخلاقی اور معاشرتی حالات کو بدلنا چاہتے تھے ۔اسی لئے انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم ،امور خانہ داری ، تعداد ازدواج کے ساتھ ساتھ نکاح وخُلع کے مسئلوں کو اہمیت دی ۔ساتھ ہی عورتوں میں پھیلی ہوئی توہم پرستی کو موضوع بنایا۔اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی تلقین کی ۔اس باب میں مذکورہ مسائل سے بحث کی گئی ہے ۔

مقالہ کا آخری حصّہ اختتامیہ ہے ۔جس میں مذکورہ تمام پانچ ابواب سے متعلق کئے گئے مطالعہ کا تجزیہ شامل ہے ۔مقالہ کے آخر میں جن کتابوں سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے ان کی فہرست دی گئی ہے ۔

اس مقالہ کی تیاری میں مجھے اپنے اساتذہ ،دوست واحباب کے قیمتی مشورے ملے ۔جن کی میں بے حد ممنون ہوں ۔خاص طور سے اپنے والد محترم الحاج علی شاہ خان صاحب ، والدہ محترمہ حجانی نسیم اختر صاحبہ اور میری بہنیں ۔۔۔

عائشہ کوثر (M.A.B.Ed) صوفیہ انجم (M.Sc,M.Ed.M.Phil) ، شافیعہ انجم (M.C.A,B.Ed) ،معراج اختر (B.A.LLB.LLM) اور میرے برادرعزیز عمران خان (M.A,B.Ed) اور میرے ہردلعزیز ماموں جان ناصر خان واسلم خان ان تمام کی شفقت ،محبت اور محنت نے مجھے حوصلہ بخشا جس کی وجہ سے یہ مقالہ پائے تکمیل کو پہنچا ان کے علاوہ میرے نگراں کارڈاکٹر حمیداللہ خان کی بے لوث رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی میں ممنون و مشکور ہوں ساتھ ہی جن اساتذہ نے مجھے اس تحقیقی مقالے کی خاطر مشورے دئے ان میں ڈاکٹر حمید سہروردی ، ڈاکٹر صدیقی ممتاز جہاں ، ڈاکٹرعقیلہ غوث ، میرے کالج کے انچارج پرنسپال جناب ڈاکٹر شری ہری ڈھونڈ ، صدر سوسائٹی جناب ڈاکٹر نارائن راو منڈھے۔ میرے معاون لکچرر جناب عبدالوہاب۔

آخر میں میرے لخت جگر محمد شاہ ویز انعامدار جس نے مجھے کام کرتے وقت کسی قسم کی کوئی فرمائش نہیں کی اس کی ممنون ہوں۔ ناانصافی ہوگی اگر میں اپنے شوہر ڈاکٹر سیّد مشیرالدین انعامدار کا شکریہ ادا نہ کروں کیونکہ ان کی مدد اور حوصلہ افزائی کے بنا یہ تحقیقی مقالہ پائے تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔اسی طرح میرے ساس وسُسر جناب قاضی مُبشرالدین عُرف نواب صاحب۔ان کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔

ساتھ ہی تمام اہل خاندان دوست وساتھی کی بھی میں ممنون ومشکور ہوں جنھوں نے گاہے گاہے مدد کی ان سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔

پٹھان عالیہ کوثر علی شاہ خان
صدر شعبہ اردو
راشٹر ماتا اندرا گاندھی مہاودیالیہ، جالنہ

DECLARATION

I, the undersigned, hereby declare that the thesis entitled **“DEPUTY NAZEER AHMED KE NAVELON KA SAMAJI MUTALA”** is written by me and submitted to the Swami Ramanad Teerth Marathwada University, Nanded. For the Award of Ph.D. Degree in Urdu. The present work is of original nature to the best of my knowledge. This piece of work has not been submitted for the award of any degree of any University.

Place :

Date :

PATHAN ALIYA KAUSER
Head of Department, Urdu
Rashtra Mata Indira Gandhi
Mahavidyalaya,
JALNA Dist. JALNA

تحقیقی مقالے کا عنوان

ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں کا سماجی مطالعہ

فہرست

☆ ☆ ☆

باب اوّل

ادب اور سماج کا رشتہ

ادب کا مفہوم:

لفظ 'ادب' بڑا جامع المعانی ہے اور وسیع مفہوم کا حامل بھی۔ یہ لفظ عربی زبان کے توسط سے اردو میں منتقل ہوا ہے۔عربی میں اس کے معنی 'زندگی بھر' کے ہیں۔اس کے علاوہ عربی میں یہ لفظ تعلیم وتربیت ،سلیقہ، آداب مجلس اور وضع داری کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اردو میں بھی اس کے کئی معنی ہیں ،مثلاً ہر چیز کو حد نگاہ میں رکھنا ،حفظ مراتب کا لحاظ ،تہذیب ، شائستگی وغیرہ کے ہیں۔ظہور اسلام سے پہلے عربی زبان میں ضیافت اور مہمان نوازی کے معنوں میں ادب کا استعمال ہوتا تھا بعد میں اس کا ایک اور مفہوم بھی اس میں شامل ہوا جسے ہم مجموعی طور سے شائستگی کہہ سکتے ہیں جو عربوں کے نزدیک زمانہء قدیم سے آج تک لازمہ شرافت سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ شائستگی اور حسن سلوک بھی ادب کے معنوں میں داخل ہوئے۔ جو انسان مہمان نوازی میں شائستہ ہوگا وہ عام زندگی میں بھی شائستہ ہوگا۔اس سے ادب کے لفظ میں شائستگی آ گئی یہی نہیں ادب کے مفہوم میں خوش بیانی کا بھی شمار ہے۔زمانہ قدیم میں عرب میں خوش بیانی کو اعلیٰ ادب کہا جاتا تھا۔آہستہ آہستہ ادب کے مفہوم میں گھلاوٹ،نرمی ،گداز ،انکساری،شائستگی،شرافت ،طریقہ،تمیز،لحاظ،تہذیب اور حسن سلوک وغیرہ شامل ہو گئے اور یہ لفظ جامع المعانی بن گیا۔اصطلاحی زبان میں 'ادب' زبان کے تحریری سرمایہ کو کہا جاتا ہے۔

ادب کی تعریف:

انسان کے ذوقِ آرائش و جمال کی تسکین جن فنون سے ہوتی ہے انہیں فنونلطیفہ کہا جاتا ہے۔ان میں سنگ تراشی ،فن تعمیر،موسیقی ،مصوری اور ادب وغیرہ شامل ہیں۔فنون لطیفہ کا مقصد تخلیق حسن ہے اور اس سے جو پیکر وجود میں آتا ہے اسے فن کہتے ہیں۔ یہ تمام فنون دراصل انسانی جذبات کے اظہار کے وسائل ہیں۔فنونِ لطیفہ کی سب سے اہم اور طاقت ور شاخ کا نام ادب ہے۔اس لیے کہ دیگر فنون لطیفہ کو کسی نہ کسی مادی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے جیسے مصور کو برش و رنگ کی ،مجسمہ ساز کو تیشہ و سنگ کی ،موسیقار کو رباب و چنگ کی اور معمار کو خشت وسنگ کی لیکن ادب کو کسی مادی وسیلے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ادب کو انسان کے تخلیق کردہ الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے یہی اس کا واحد وسیلہ ہے۔

صدیوں سے ادب کی تعریف وتشریح اور اس کی اہمیت وافادیت کو لے کر مختلف قسم کی بحثیں ہوتی آرہی ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ادب زبان کے تحریری سرمایہ کو کہا جا سکتا ہے لیکن ہر تحریر ادب کے دائرے میں نہیں آسکتی کیوں کہ فلسفہ ،معاشیات،عمرانیات،تاریخ اور سائنس کے مختلف مضامین پر لکھے جانے والے مضامین

کو ہم ادب نہیں کہہ سکتے ۔اس سلسلے میں علمائے ادب کے مختلف گروہ ہیں ۔ایک گروہ کا نقطہ نظر ہے کہ ادب ایک خاص قسم کی تحریر کا نام ہے جس کا ایک مخصوص اسلوب اور ایک خاص زبان ہی نہیں بلکہ اس کا ایک خاص مواد بھی ہوتا ہے۔ادب کے خام وسائل مختلف ہو سکتے ہیں لیکن تخلیق کی صورت میں اس کا مخصوص موضوع اور خاص ہئیت ہوتی ہے جس کی وجہ سے ادب اور غیر ادب میں تمیز کی جا سکتی ہے۔علمائے ادب کے دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ادب کی مقررہ اور مروجہ ہئیتوں میں جو کچھ لکھا جائے وہ ادب ہے خواہ اس کا معیار کچھ بھی ہو۔اگر اس کا معیار پست ہوگا تو اس کی قیمت کم ہوگی اور اس کا معیار بلند ہوگا تو اس کی اہمیت بھی زیادہ ہوگی ۔ایک گروہ کا نظریہ کہ مطابق ادب کا تعلق صرف ادبی ہئیت یا شکل سے نہیں بلکہ ایک مخصوص معیار سے ہے یعنی کہ تحریر میں اگر تخلیقی انفرادیت اور اپج نہ ہو تو اسے حقیقی معنیٰ میں ادب نہیں کہا جا سکتا۔اس لیے اس گروہ کا کہنا ہے کہ رسمی فرسودہ او رسطحی تحریریں ادب کے دائرے میں نہیں آ سکتیں۔اردو انسائکلو پیڈیا میں ادب کے تعلق سے ماہرین کے خیالات کچھ اس طرح بیان کئے گئے ہیں:

''میتھو آرنلڈ کے نزدیک وہ تمام علم جو کتب کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے 'ادب کہلاتا ہے۔کارڈینل نیومین کہتا ہے' انسانی افکار، خیالات اور احساسات کا اظہار زبان اور الفاظ کے ذریعے ادب کہلاتا ہے۔نارمن جودک کہتا ہے کہ ادب مراد ہے اس

تمام سرمایہ خیالات واحساسات سے جو تحریر میں آچکا ہے اور جسے اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔'' [1]

ادب کا تعلق سے ہمارا خیال ہے' ادب فکر واحساس ، اظہار کے تناسب اور حسن کا دوسرا نام ہے۔ جو بات اظہار کے عام طریقوں سے ہٹ کر خوب صورت پیرائیوں میں کہی جاتی ہے وہ ادب کا خام مواد بن جاتی ہیں پھر بیان کا خوب صورت پیرایہ اسے ادب کی صورت بخشتا ہے۔ ادب ایک تخلیقی حقیقت ہے وہ انسان کے فکر و احساس اوراس کے تجربات وتاثرات کا ترجمان ہوتا ہے۔ادب فن کار کی ذات اوراس کے گرد وپیش کے ماحول دونوں کا آئینہ دار ہے۔ اس کی عام بول چال کی زبان سے مختلف اور موثر ہوتی ہے۔اس کا نرالا طرز اظہار اور ایک مخصوص اسلوب ہوتا ہے۔ ادب میں انسانی جذبات اوراس کے خواب کا عکس نظر آتا ہے۔ جب تک انسان کے جذبات موجود ہیں ادب کی اہمیت باقی رہے گی اس لیے کہ یہی وہ وسیلہ ہے جس سے انسانی ذہن وروح ارتقائی مدارج طے کرتے ہیں۔ اگر انسان سے اس کے خواب چھین لیے جائیں اوراس کی خواہش صرف مادی ضرورت کی حد تک محدود ہو جائے تو انسان ایک چلتی پھرتی مشین بن جائے گا۔ ادب نے انسان کو مہذب اور متمدن بنایا اور انسانی ارتقاء کے لیے راہیں ہموار کیں۔

[1] 'ادب' اردو انسائکلو پیڈیا، مرتبہ ۱۲ مارچ ۲۰۱۲ء، صفحہ ۱

سماج کی تعریف :

لغت میں سماج کے معنی انجمن ،معاشرہ، سوسائٹی وغیرہ کے ہیں۔
اصطلاح عام میں سماج سے مراد ایک خاص جغرافیائی ماحول میں رہنے بسنے والے انسانوں کے گروہ کو کہتے ہیں جو خاص حالات کے تحت یکجا رہائش اختیار کرتے ہیں اور اپنی ایک علاحدہ سماجی شناخت کے حامل ہوتے ہیں۔سماج کے مختلف شعبوں کو سماجی وسعت اور ترقی نے پروان چڑھایا کیوں کہ انسان صرف طبعی ضروریات کا غلام نہیں ہے وہ اپنے گرد وپیش کے واقعات اور حالات ومظاہرات سے بھی متاثر ہوتا ہے اور فطری طور پراس کا اظہار چاہتا ہے۔زمانہ قدیم کا انسان فطرت سے بہت قریب تھا۔وہ جب آسمان پر ستاروں کو جھلملاتے دیکھتا یا ہواؤں کی خنکی اور سرسبز شاداب جنگلوں اور پھلوں کے نظارے اسے ایک خوش گوارا حساس سے ہم کنار کرتے تو وہ ان سے محظوظ ہوتا ابتداء میں وہ حرکات وسکنات یا آوازوں کے وسیلے سے اپنے جذبات کی ترجمانی کرنے کی کوشش کرتا تھا۔لیکن رفتہ رفتہ زبان تشکیل میں آئی تو انسان نے پہلے پہل تُک بندی اور پھر بے ترتیب مصرعوں سے ملتی جلتی شکل میں اپنے جذبات وتاثرات کوسمونے کی کوشش کی ۔ادھورے اور بے ترتیب مصرعوں پر مشتمل گیتوں سے لے کر باقاعدہ ادبی اوصاف

تک پہنچنیکے لیےسینکڑوں برس کا فاصلہ طے کرنا پڑا، اس کے بعد انسان مہذب بننے میں کامیاب ہوا۔ مہذب انسانوں کے گروہ کوسماج کا نام دیا جاتا ہے۔

ادب اور سماج کا رشتہ

انسان اپنے فطری تقاضوں کے زیر اثر اور اپنے گرد و پیش کے ماحول کے ذریعے ایک مخصوص فضاء میں پرورش پاتا ہےاور اپنی دل چسپیوں اورتفریحوں ،تصور اورتخیل کی نئی دنیا تلاش کرتا رہتا ہے۔اس کی تمام دل چسپیوں اور صلاحیتوں میں فنِ لطیف انسانی زندگی کا سب سے بہترین کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔مصوری، رقص ہو یا ادب، انسان کے نازک ترین احساسات و جذبات کا حصہ ہیں اور مذکورہ صلاحیتوں یاادب ان میں سے کوئی بھی شئے ایسی نہیں جس کا تعلق سماج سے نہ ہوخاص طور پرشعر و ادب کی دنیا انسانی وسیلے سے سماج ،معاشرہ ،تہذیب اور سیاست کے مختلف پہلوؤں کو اپنے فن پارے کا موضوع بناتا رہتا ہے۔

ہر دور اور ہر عہد میں ادب کےتصورات ،اغراض اورسماج سے اس کے رشتے مختلف انداز سے وابستہ ہوتے ہیں لیکن ادب وسماج کے رشتوں کے بارے میں ناقدین اور ماہرین کی رائیں مختلف رہی ہیں۔

۱۔ سماج شاستر، ایم۔ایم۔ گیتا، ڈی ڈی شرما، ص۲

۲۔ سماج شاستر، ایم۔ایم۔ گیتا، ڈی ڈی شرما، ص۲

۳۔ سماج شاستر، ایم۔ایم۔ گیتا، ڈی ڈی شرما، ص۴۳

سماج اور انسان کی اصل تعریف سے متعلق سوچنا اور اس کی اہمیت و افادیت کا اعتراف کرنا ایک بہت وسیع موضوع ہے لیکن چند ماہرین کی رائے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سماج کیا ہے اور اس کی ممکنہ تعریف کیا ہوسکتی ہے بقول جارج سمبل:

''سماج کو ان لوگوں کا گروہ ماننا ہے جو آپس میں باطنی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ ہوں۔'' ۱

اسی طرح رالف لینٹین کے مطابق '' سماج کو اسی جماعت کی شکل میں شامل کیا ہے جس میں انسان اپنے آپ کو یکجا کرنے اور سماجی اکائی کی شکل میں سوچنے کے لیے کافی لمبے وقت کے ساتھ رہتے اور کام کرتے رہے ہوں۔'' ۲

فیئر چائلڈ نے سماج کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے:

''سماج انسانوں کا ایک ایسا گروہ ہے جو اپنے بہت سے ضروری مقاصد جن میں لازمی طور پر خود کی حفاظت یا پیٹ بھرنا، کپڑا پہننا اور خود کو اس میں شامل کرنا ہے اور ان سب چیزوں کو پورا کرنے میں مدد کرتا ہے۔'' ۳

کہاں جا سکتا ہے انسان سماج میں رہ کر ہی زندگی گزارتا ہے اور سماج میں ہونے والی تبدیلیوں اور ضرورتوں سے بہرآور رہتا ہے۔ اپنے تجربوں کی بنیاد پر وہ اپنے سماج کا حال بیان ہی کرتا رہتا ہے جو شعری یا نثری شکل میں موجود ہے غرض یہ کہ

۱ سماج شاستر، ایم۔ایم۔ گپتا، ڈی ڈی شرما، ص۲

۲ سماج شاستر، ایم۔ایم۔ گپتا، ڈی ڈی شرما، ص۲

۳ سماج شاستر، ایم۔ایم۔ گپتا، ڈی ڈی شرما، ص۴۳

سماج اور انسان کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی ادب خلاء میں جنم نہیں لیتا۔ ادب کا خالق سماج کا ایک ذہین اور حساس ذمہ دار فرد ہوتا ہے۔ وہ اپنے شب و روز میں سماجی نشیب و فراز، واقعات و حادثات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر ادبی فن پارے کی شکل میں پیش کر دیتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سماج و ادب کا براہ راست رشتہ ہے اور شاید اسی لیے ادب کو سماج کا آئینہ بھی کہا گیا ہے۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ ادب میں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ ویسے ادیب کا اپنا ایک نقطہ ءنظر ہوتا ہے جس کے تحت وہ زندگی کی رنگینیوں کو ابھار کر کوئی فن پارہ

تخلیق کرتا ہے۔ شاید اسی لیے مشہور فلسفی ٹالسٹائی نے ادب کو زندگی کا بہترین وسیلہ قرار دیا۔ مشہور فلسفی جی بی برسلی نے کہا ''ادب زندگی کا نگار خانہ ہے جس کا دائرہ کافی وسیع ہے۔'' [۱]

بقول پروفیسر آل احمد سرور ''ادب زندگی کی عکاسی بھی کرتا ہے اور اس کی بدلتی ہوئی قدروں کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ اس کی تصویریں بھی متحرک ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں اس کی اپنی روح بھی شامل ہوتی ہے۔ واقعات اور حادثات کا ذکر کرتے ہوئے وہ انکشاف بھی کرتا ہے۔ اس انکشاف میں خوش آئند مستقبل کے امکانات پوشیدہ ہوتے ہیں۔ [۲]

درج بالا اقتباسات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہر فن کار و قلم

۱ ڈاکٹر محمد ایمن انصاری، اردو ناول میں سماجی مسائل کی عکاسی، ص ۲۷

۲ آل احمد سرور، ادب اور نظریہ، ص ۲۷

کار اپنے اردگرد کے ماحول و حادثات سے متاثر ہوکر ہی لکھتا ہے۔اس لیے ادب میں انسانی زندگی،تہذیب، کلچر کی عکاسی ہوتی ہے جو کہ ایک سماجی عمل بھی ہے۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ایک اچھا ادب بھی وہی ہوتا ہے جس میں سماجی زندگی کے مسائل کی اچھی اور بہترین عکاسی کی گئی ہو۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ زندگی کو سمجھنے کے لیے سماج کے حالات کا جائزہ لینا ہی پڑتا ہے کیونکہ ادیب یا شاعر کی زندگی سماج سے گھری رہتی ہے اور آئے دن سماج میں ہونے والی تبدیلیوں سے وہ متاثر بھی ہوتا رہتا ہے۔ ادب اور سماج سے متعلق احتشام حسین کا کہنا ہے''ادب ادیب کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ادب زندگی کی از سر نو تخلیق ہے۔ادب انسان کی مادی کشمکش کا دلکش عکس ہے۔ادب صرف لفظوں کی خوب صورت موتیوں کو فن کی لڑی میں پرونے کا نام نہیں درحقیقت ادب وہ ہے جن میں زندگی کے تجربات اور مشاہدات بیان کیے گیے ہوں۔[1]

کہا جا سکتا ہے کہ ادب ایک طرح سے ہماری زندگی کا آئینہ بھی ہے اور ہماری تہذیب وتمدن کا عکس بھی، ہماری زندگی جن حالات سے نبرد آزما ہوگی بالکل اسی طرح کا ادب

بھی ہوگا کیوں کہ ادیب اپنی تخلیقات کے لیے زندگی کے وسیع وعریض کینوس پر اپنی سوچ و فکر کے ساتھ مختلف صورتیں مثلاً سماجی، اخلاقی، اقتصادی آزادی اور فتح وشکست کو منعکس کرتا ہے۔

[1] احتشام حسین، ادب اور سماج، ص۲۰

زندگی ہو یا ادب ان کا محور انسان اور انسانی ممکنات ہی ہوتے ہیں۔انسان مختلف جذبات اوراحساسات کے سہارے زندگی جیتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جذبوں کے اظہارکوادبی شکل وصورت عطا کرنے والے شاعر یا ادیب کہلائے گیے ہیں۔ ہمارے ملک کے ادیبوں اورشاعروں نے بھی ادب کے ذریعے سماج میں ایک نئی روح پھونکی اور ادب کے حوالے سے قوم پرستی ،وطنیت ،آزادی ،مساوات ، بھائی چارگی اوراخوت کوفروغ دیا۔

ادب براہ راست زندگی اوراس کے مسائل سے رو بہ رو ہوکر مستقبل کی راہیں ہموار کرتا ہے۔سماج کی ترقی اور بہتری کا بہترین وسیلہ بھی ادب ہی ہے کیوں کہ وہ سماج سے فیضان حاصل کرتا ہے اور پھر اسی زندگی اور سماج کو فیضیاب بھی کرتا ہے۔ادب چاہے نظمیہ ہو یا نثر کہیں نہ کہیں سماج سے جڑا ہوتا ہے۔شاعری کی مختلف اصناف چاہے وہ موضوعاتی ہوں ،مرثیہ یا قصیدہ ،رباعی یا پھر جدید نظم یا غزل سبھی سماج کے عقائد،رسوم اورروایتوں کے غماز ہیں۔وہیں نثری اصناف میں مضمون ہو یا داستان ،ناول ہو یا افسانے ،انشائیہ ہو یا خطوط یا پھر سفرنامے ہرصنف میں سماج کا عکس نظر آتا ہے۔اس لئے یہ کہنا غلط نہیں کہ ادب اور سماج ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ادب کی تشکیل وتعمیر میں ہر دور کے تقاضوں،ضرورتوں ، بدلتی ہوئی سماجی ادبی ولسانی تہذیب کی جھلکیاں جلوہ گر ہوتی ہی ہیں۔

نثری ادب کا مطالعہ کیا جائے تو ہم بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حکایتوں میں نصائح پند اور اخلاقی درس کی باتیں مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہیں ۔حکایت بیان کرنے

والے برگزیدہ اشخاص کا یہ اپنا طریقہ تھا کہ وہ مذہب کی باتوں کواور اصلاح معاشرہ کی خاطر کوئی قصہ بیان کردیتے تا کہ لوگ اس قصے سے کوئی مثبت درس حاصل کر سکے یعنی سماج اور معاشرے میں پھیلی ہوئی بے قاعدگیوں کو دور کرنے کے لیے حکایتوں سے کام لیا جاتا تھا۔

جب داستانوں کا دور شروع ہوا تو ان میں بھی اعلیٰ طبقہ کی شان وشوکت ،ان کے آداب مجلس ،لباس ،وضع قطع کے ساتھ ساتھ بادشاہ ،امراء،وزیر،شہزادیاں ،کنیزیں اورغلام کے علاوہ جادوگر ،جادوگرنیاں ،جن ،پریاں یہاں تک کہ مافوق الفطرت کرداروں کے ذریعے سماج کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی جاتی رہی ۔ان ادبی تخلیقات میں سماج کا روایتی انداز پورے شباب پر نظر آتا ہے بلکہ داستانوں کا بنیادی مقصد مذہبی امور کے ساتھ سچائی کی برائی پر فتح وکامرانی کو اجاگر کرنا ہی ہوتا تھا۔مہم جوئی اور پریشانیوں میں غیبی امداد اس بات کی غماز تھی کہ سماج میں پھیلی ہوئی برائی کو کوئی دور کرنا چاہتا ہے تو اللہ بھی اس کی مدد کرتا ہے۔اس لیے پریشان یا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ۔

وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ نثری ادب کی اوصاف میں تبدیلی آتی گئی اور ۱۸۵۷ء تک آتے آتے داستانیں کم ہو کر نئی صنف ادب ناول کا وجود عمل میں آیا۔ اردو میں ڈپٹی نذیر احمد نے بدلتے ہوئے سماجی حالات اور ضرورتوں کے پیش نظر ناول کی بنیاد رکھی۔

ادب اور سماج کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں جس طرح سماج ادب پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح اچھا ادب بھی سماج کو متاثر کرتا ہے۔ ادب سماج سے مواد حاصل کرتا ہے اور زبان کو وسیلہء اظہار بناتا ہے۔ زبان ایک سماجی ضرورت ہے۔ زبان کے وسیلے سے سماج ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے۔

ادب اور سماج کے باہمی رشتے کے تعلق سے ہمارے ناقدین و ادباء میں اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ ہر دور کا ادب یکساں ہوتا ہے اور زمانے یا حالات کی تبدیلی سے اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ زندگی اور سماجی حالات کا تغیّر ادب کے تاثر اور اس کے حفظ آفرینی پر کوئی اثر مرتب نہیں کرتا لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔ ایک دور کے لوگ جن باتوں سے محظوظ ہوتے ہیں، دوسرے عہد کے افراد کا ردعمل اس کے متعلق کچھ اور ہوتا ہے۔ ہر دور کا ادبی مزاج اپنے عصر کے اعتبار سے تشکیل پاتا ہے۔ قدیم داستانوں میں مافوق الفطرت عناصر ہوتے تھے جو دیو، پری اور طلسمات کے

قصے سنائے جاتے تھے۔ان سے اس عہد کے لوگ بہت متاثر ہوتے تھے لیکن آج پرستانوں اور کل کے گھوڑے کی کہانی سن کر نہ لوگ ان سے محظوظ ہوتے ہیں نہ انہیں صحیح تصور سمجھتے ہیں۔اس لیے یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور کا ادبی ذوق ومزاج اس کے سماجی ماحول کا پروردہ ہوتا ہے۔

ادب اور سماج کے تعلق سے ماہرین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ اگر ہم عصری رجحانات پر بہت زیادہ زور دیں تو ادب کی آفاقیت کے نظر انداز ہونے کا اندیشہ ہے۔آفاقیت سے مراد ادب کی یہ خصوصیت کہ وہ ہر دور سے متعلق ہوتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہر عہد کا فن کا اپنے دور کی تہذیبی ،سماجی اور سیاسی کشاکش سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتا۔دراصل ہر ادیب وشاعر اپنے عہد کے خیالات وتصورات کو پیش ضرور کرتا ہے لیکن عصری رجحانات میں ایسے عناصر کا اضافہ کرنا جو ہر دور سے متعلق ہوں صرف بڑے فن کار کا کام ہے اور ایسا ادب پارہ جس میں عصریت اور آفاقیت موجود ہو اپنے دور کی نمائندگی تو کرتا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ ہر دور کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔

فن کار اپنے گرد وپیش کے ماحول اور خارجی زندگی کے تجربات سے جو مواد حاصل کرتا ہے اسے جوں کا توں ادب میں پیش نہیں کرتا بلکہ اپنے جذبے کی آنچ اور اپنی شخصیت کی بھٹی میں تپا کر اسے موثر اور دلنشین بنا دیتا ہے اور موزوں و مناسب پیرایئے میں پیش کرتا ہے۔درحقیقت فن کار اپنے عہد اور زماں ومکاں میں اسیر ہو کر نہیں

رہ جاتا بلکہ اسکی تخلیقات ایک مخصوص عہد کی پیداوار ہونے کے باوجود ہر عہد سے اپنا فنی رشتہ استوار رکھتی ہے۔ادب کا دائرہ اتنا وسیع ہوتا ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل سب اس کی زد میں ہوتے ہیں۔ادب مستقبل کے لیے مشعل راہ بھی ہوتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ادب اور سماج کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے بدن سے کپڑے کو الگ کرنا۔

ادب میں سماج کا عکس:

یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ بظاہر سماج سے ادب کا رشتہ آسان دکھائی دیتا ہے وہ اتنا ہوتا نہیں۔سنجیدگی سے غور کرنے پر سی ادب اور سماج کی گہری وابستگی سامنے آسکتی ہے۔سماج سے ادب کے رشتے کا تجزیہ کرنے والے دو طرح کے لوگ ہیں ایک وہ جو سماج کو سمجھنے کے لیے ادب کا استعمال کرتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو ادب کو سمجھنے کے لیے سماجیاتی نقطۂ نظر کو اپناتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ادبی تخلیق ایک سماجی عمل ہے اور تخلیق سماجی پیداوار لیکن ادب کی تخلیق فرد کرتا ہے۔اس لیے سماج سے ادب کے رشتے کو سمجھنے کے لیے سماج سے تخلیق کار کے مضبوط تاریخی رشتے کو سمجھنا بے حد ضروری ہو جاتا ہے کیوں کہ فن پارے میں سماج کی خارجی اور داخلی حالات کو نہ صرف بیان کیا جاتا ہے بلکہ اس کا اثر زبان پر ہوتا ہے۔زبان اظہار کا ایک وسیلہ ہے اور وہ مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں بلکہ لوگوں تک پہنچانے میں معاون و

مددگار ہے۔ادبی تخلیقات کے موضوع ساخت سے سماج کے خدو خال کو اور فکری سرچشموں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اچھا ادب وہی ہے جس میں سماجی زندگی کے مسائل کی بہترین عکاسی کی گئی ہو۔زندگی کو سمجھنے کے لیے سماج کا جو بنیادی ڈھانچہ ہے یا سماج کے جو حالات ہیں ان کا جائزہ لینا بھی از حد ضروری ہے۔کیونکہ طبقاتی کشمکش ،سیاسی مسائل،معاشی حالات اور سماجی رسم ورواج کو ادب میں بیان کیا جاتا ہے۔اور ادب کا موضوع بنایا جاتا ہے۔

اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ہم کہ سکتے ہیں کہ ادب جن جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے وہ ادیب کے گرد و نواح کی ہی دنیا ہوتی ہے۔جیسے ہماری زندگی کے حالات ہونگے ویسے ہی ہمارا ادب ہوگا۔اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی اپنے اپنے دور کے حالات اور لسانی مروجہ اصولوں کو اپنایا اور سماج میں ایک نئ روح پھونکی ۔ادب کے حوالے سے ہی جنگ آزادی کے جذبوں کو فروغ دیا گیا ادب کی بنیاد مادی حقائق اور سماجی شعور پر قائم ہوا کرتی ہے اور اپنے لیے مستقبل کی راہیں ہموار کرنے اور سماج کو فیض پہنچاتا ہے۔

۱۸۵۷ء سے قبل ادب بازیابی کی زیرسرپرستی درباروں میں ہوتی تھی جہاں بادشاہ،امراء،نوابین کی فرمائش پر ادب تخلیق کیا جاتا تھا۔جو عام طور پر دل جوئی کا سامان ہوا کرتا تھا اور جس کا مقصد تفریح اور سکون پہنچانا تھا جسے سن کر اہل دربار اور

ارباب وقت محظوظ ہوا کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء کے بعد حالات تبدیل ہوئے زندگی کے ہر شعبے میں زبردست انقلاب آیا ادب کی تمام اصناف پر ان تبدیلیوں کے اثرات پڑنے لگے۔شعری رویوں میں تبدیلی آئی۔سرسید احمد خان،شبلی نعمانی،الطاف حسین حالی،محمد حسین،آزاد،ڈپٹی نذیر احمد کی کاوشوں سے نظم و نثر ایک نئی جہت سے دوچار ہوئیں۔مغرب سے آئی ہوئی نئی تہذیب اور نئے ادب نے اردو ادب پر اپنے اثرات مرتب کئے جس کی وجہ سے سوچ اور فکر میں تبدیلی آنے لگی۔سرسید نے تو باقاعدہ اصلاحی تحریک کی بنیاد ڈالی۔حالی نے شعر و ادب میں انقلابی صورت پیدا کر دی اور عوام کو بدلتے ہوئے حالات کا احساس دلایا اور مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر دنیائے تنقید کی اردو کی پہلی اینٹ رکھی۔

ایسے حالات میں داستانوں کی فرضی اور خیالی و غیر حقیقی کہانیوں میں تبدیلی آنا ناگریز تھا۔چنانچہ کہانی کا سفر بھی ایک نئے موڑ پر آ گیا اور اصلاح معاشرہ کے خیال کے تحت کہانیاں ناول کا روپ اختیار کرنے لگیں کیوں کہ ناول کا موضوع انسانی زندگی ہے اس لیے یہ واحد صنف ہے جس میں انسانی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کی جانے لگی۔مغربی ادب اور بدلتے ہوئے ادبی ماحول نے ڈپٹی نذیر احمد کو فن ناول نگاری کی جانب متوجہ کیا اور انہوں نے اردو ادب کئی کو اہم ناول دئے جن کا مطالعہ آئندہ ابواب میں لیا جائے گا۔

بابِ دوّم

اردو ناول کا آغاز وارتقاء

اُردوناول کا آغاز وارتقاء

ناول اردو نثر کی ترقی یافتہ صنف ہے۔جس میں انسانی زندگی کے گوں نا گوں رنگوں کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ناول میں انسانی زندگی کے سچے واقعات کا بیان کچھ اس انداز میں کیا جاتا ہے کہ قاری کو اس میں اپنے آپ یا اپنے آس پاس کے ماحول کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔کہانی کہنا اور سننا انسانی فطرت میں داخل ہے۔کہانی کے آغاز کا سراغ لگانے کی کوشش کی جائے تو اس کا سرا انسان کی زندگی کے آغاز سے جا ملتا ہے۔ جب سے انسان اس دنیا میں آیا اور اس کی زندگی میں روز مرہ کے مختلف واقعات رونما ہونے لگے اسی وقت سے کہانی کا آغاز ہوگیا۔ابتدا میں کہانی کا جو روپ تھا آگے چل کر اس میں مبالغہ کی ملاوٹ ہوئی تو داستان نے جنم لیا جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا اس کی مصروفیت بڑھتی گئی داستان کی اہمیت کم ہوتی گئی۔ چونکہ داستان طویل کہانیوں کا مجموعہ ہوتی ہے اس کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔صنعتی دور کا آغاز ہوا تو انسان کی مصروفیت میں اضافہ ہوگیا۔ وقت کی قلت نے ایسی داستانیں سننے یا ان کے مطالعہ سے باز رکھا۔ دوسرے یہ کہ داستانوں کو ان میں اپنی زندگی کی سچی تصویر کشی نہیں کی جاتی اس لیے جدید دور کے انسان کو ان میں اپنی زندگی کا عکس نظر نہیں آیا۔اس لیے

اس نے ایسی صنف کی ایجاد کی جس میں ہماری زندگی کی حقیقی ترجمانی ہو۔ یہ صنف ناول ہے۔جس نے اسی داستان کی کوکھ سے جنم لیا۔ ناول دراصل صنعتی دور کی پیداوار ہے۔

ناول کا آغاز میں سب سے پہلے اطالوی ادب ہوا۔ اطالوی زبان میں اسے ناویلا کہا جاتا تھا۔ اطالوی ادب سے یہ صنف برطانوی ادب میں جب پہنچی تو انگریزی ادب نے اسے ناول کا نام دیا۔اردو میں یہ صنف انگریزی زبان کے توسط سے داخل ہوئی اوراپنے انگریزی نام سے ہی جانی جانے لگی ۔ لفظ ناول کا اردو میں استعمال سب سے پہلے شاد عظیم آبادی نے کیا۔ ناول کے معنی نیا کے ہیں۔

ابتدائی ناول نگاری

اردو ناول کا آغاز نذیراحمد کے ہاتھوں ہوا۔ انہوں نے اپنی لڑکیوں کی اخلاقی تعلیم کے لیے حقیقی زندگی سے مختلف واقعات کوچن کر نئے انداز میں قصہ لکھا۔ اس کا نام 'مراۃ لعروس' رکھا۔ یہی قصہ آگے چل کر اردو کا پہلا ناول قرار دیا گیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل پڑا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو میں اس صنف نے حیرت انگیز ترقی کی۔ اپنی ابتداء سے لے کرآج تک ناول ہر دور میں مقبول صنف نثر رہی ہے۔ نذیراحمد نے ناول اوراصلاح معاشرت میں چولی دامن کا رشتہ قائم کیا۔ اس میں ان کے منطقی فکراور اصلاحی مزاج کوخاصہ دخل ہے۔

نذیر احمد کے ناولوں میں خامیاں ہیں ااور ہمارے بعض ناقدین تو ان کے ناولوں کو ناول ماننے سے ہی انکار کرتے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''بہت سے نقاد نذیر احمد کا ناول نگار نہیں مانتے لیکن یہ محض اصطلاح کا چکر ہے میں ان کی سماجی بصیرت اور تاریخی شعور پر نظر رکھ کر انہیں اردو کا پہلا اور بہت اہم ناول نگار تسلیم کرتا ہوں'' [1]

دھیرے دھیرے زندگی اور فن کا رشتہ وسیع ہوتا رہا اور اسی درمیان مقصد اور فنی احساس کے مابین توازن بھی قائم ہوا جس نے نذیر احمد کے ''فسانہ مبتلا'' تک پہنچتے پہنچتے ایسی شکل اختیار کر لی جہاں واعظ اور فنکار یکساں نظر آنے لگے۔

سرشار اردو کے دوسرے ناول نگار ہیں نذیر احمد نے اردو میں جس صنف کی بنیاد ڈالی تھی سرشار نے اسے آگے بڑھایا۔ ان کے ناولوں میں اس عہد کے لکھنو کی معاشرت کی تصویر کشی کثرت سے ملتی ہے۔ جنہوں نے انسانی زندگی کے پھیلاؤ اور ان کی گہرائیوں پر روشنی ڈالی اور اردو ناول کو اس ابتدائی دور میں ایک ایسی روایت سے آشنا کرایا جو فنی لوازم سے پر ہے۔ انہوں نے لکھنو معاشرت کو اپنا موضوع بنا کر وہاں کے لوگوں کی اجتماعی زندگی کی اس طرح عکاسی کی کہ سب کو اپنی اصلی شکل نظر آنے لگی۔ سرشار نے پوری طرح لکھنو کا مشاہدہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول ''فسانہ آزاد''

[1]: ذوق ادب اور شعور، احتشام حسین لکھنؤ، ۱۹۵۵ء، ص ۳۵

میں ایک خاص عہد کالکھنو نمایاں ہے۔

سرشار کے ناول فسانہ آزاد کے مطالعے کے بعد ان کی بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے کیوں کہ اس سے ان کے موضوع سے پوری واقفیت مشاہدے کی گہرائی زندگی کی وسعت اور گہرائی کا احساس اور ایک مخصوص معاشرے کی تہذیب وتمدن اور رسم و رواج کا علم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سرشار نے داستان کی چھوڑی ہوئی روایت کے راستے پر چل کر ہمیں کئی ایسے کرداروں سے آشنا کرایا ہے۔ جو ایک مخصوص مزاج کے مالک خاص طبعیت کے حامل اور مثالی ہیں۔ مثلاً خوجی کا کردار یہ کردار ناول نگاری کے فن کی روایت کا ایک نا قابل فراموش عنصر ہے۔ یہ کردار مستقبل کے ناول نگاروں کو فن کی روشنی بخشتا ہے۔ سرشار نے اپنے ناولوں میں لکھنوی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی مصوری کی ہے اور معاشرے کے مزاج کی عکاسی کرتے ہوئے ایسے کردار کا تعارف کرایا ہے جو انسانی زندگی کا ترجمان ہے۔ یہ سارے کردار وضع قطع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں مگر سرشار کا کمال یہ ہے کہ ان کے ہم قامت کرداروں کی یکسانی کے باوجود ان میں ہر جگہ ایک انفرادی رنگ عیاں ہے۔ اس طرح ان کے ناولوں کے کردار یکسانیت رکھتے ہوئے بھی اپنا ایک خاص رنگ رکھتے ہیں۔

نذیر احمد کے بعد سرشار نے ناول نگاری کے فن اور اس کی روایت کو ایسی تقویت بخشی جو آج بھی ہمارے ادب میں نمایاں ہے۔ سرشار اپنے ناولوں کے

کرداروں اور قاری کے باہمی رشتے کی نزاکتوں کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں جبکہ نذیراحمد اپنے ناولوں میں قاری کی ذہانت پر یقین نہیں رکھتے ہیں۔ بہرحال اس طرح سرشار نے صنف ناول نگاری کو حد درجہ فروغ دیا۔ اس اعتبار سے ''فسانہ آزاد'' ''سیر کہسار'' ''جام سرشار'' وغیرہ شہرت یافتہ ناول تخلیق کر کے انہوں نے اردو ناول نگاری کے فن کو وسعت دی۔ انھیں زبان و بیان اور مکالمہ نگاری پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ یوسف سرمست اس سلسلے میں بجا فرماتے ہیں:

''سرشار نے اپنی مکالمہ نگاری سے بھی اپنی کردار نگاری کو جاندار بنادیا ہے۔ ان کے کردار کے مکالمے نہ صرف اس کردار کو انفرادیت بخشتے ہیں بلکہ اس کے اپنے طبقے اور پیشے کا بھی تعین کرتے ہیں مکالمے کے ذریعے کرداروں کو ابھارنے اور ان میں تنوع پیدا کرنے کی بہترین مثالیں سرشار نے اردو ناول نگاری کو دی''۔[1]

[1] : ۲۰ ویں صدی میں اردو ناول، یوسف سرمست، دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۲۶

تاریخی ناول نگاری

اس کے بعد شرر نے اردو میں تاریخی ناول تخلیق کر کے ایک نئی روش کا آغاز کیا اور اپنے ناولوں میں اسلام کے شاندار ماضی کا کثرت سے ذکر کیا اور اس روش کو انھوں نے اپنا نصب العین سمجھا جس طرح نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعہ مسلمانوں کے متوسط طبقے کی معاشرتی اخلاق، معاشی مذہبی اصلاح اور مستقیم پر چلانے کی کوشش کی اس طرح شرر نے ماضی کی عظمت کو دہرا کر مسلمانوں کو راہ مستقیم پر چلانے کی کوشش کی اور قومی اتحاد بھائی چارگی اور انسان دوستی کا سبق سکھایا تا کہ مسلمانوں کا مستقبل روشن ہو۔ شرر کے دل میں قوم کا درد تھا انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ پورے قوم کی اصلاح کی کوشش کی۔ انھوں نے ناول کو اپنے خیالات اور تصورات یعنی اپنی اصلاحی مقصد کو قوم تک پہونچانے کا ذریعہ بنایا اور ناول کے فن کو اردو میں برتنا شروع کیا جس میں شرر کو اولیت حاصل ہے۔ اس کی مثال ان کا ناول '' فردوس بریں'' ہے۔ ناول کی وہ خوبیاں جو نذیر احمد اور سرشار کے یہاں نہیں ملتی شرر نے ان کی طرف توجہ دی ہے۔

شرر نے اردو میں ناول نگاری کو ایک مسئلہ فن کی طرح برتا اور اپنے ناولوں میں پر تکلف منظر نگاری کی چاشنی اور چٹخارے اور ایک خاص قسم کی انشا پروری کو

اس طرح جگہ دی کہ یہ بھی فن کے اہم جز ہو گئے ۔ انھوں نے مغربی فن کے مبادیات اور مشرقی مزاج کی شوجی و رنگینی کے حسین امتزاج کو فروغ دیا جس کی تقلید ان کے بعد آنے والے ناول نگاروں نے بھی کی ۔ پروفیسر قمر رئیس شرر کی ناول کو سراہتے ہوئے لکھتے ہے :

''شرر اردو کے پہلے ادیب ہیں جنہوں نے شعوری طور پر ناول کے فن کو سمجھنے اور برتنے کی کوشش کی ہے اور ناول کی تکمیل میں بعض اجزائے ترکیبی کا خیال رکھا ہے۔'' [1]

اس کے بعد ناول نگاری کا ایک ایسا دور آیا جو ابتدائی فنی روایت کی پیروی کا دور کہلاتا ہے جہاں نذیر احمد، سرشار اور شرر کی اولیت کو فوقیت ملی اس دور کے روح رواں راشد الخیری منشی سجاد حسین اور محمد علی طیب ہیں ۔

راشد الخیری نے نذیر احمد کے فن پر مبنی ناول نگاری کی ہے ان کی ناولوں کا پیش خیمہ نذیر کی طرح مسلم معاشرہ کے مسائل کا منشور ہے ۔ دونوں کے ناولوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ نذیر احمد نے عورت کی اصلاح کے لیے ناول لکھا اور راشد الخیری نے اس کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اس کی معاشرتی حیثیت بلند کرنے کی بھی کوشش کی ہے ۔ اس طرح راشد الخیری کے ناول نذیر احمد کے مخصوص انداز میں ہیں ۔ ان کی ناول نگاری عورت کی مظلومیت کی داستان ہے ۔

[1] : پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بہ حیثیت ناول نگار، قمر رئیس، علی گڑھ ۱۹۶۳ء، ص ۱۵۹

راشدالخیری اپنے ناولوں کے ذریعہ وہی کام انجام دیتے ہیں جو اکبراله آبادی اپنی شاعری کے ذریعہ دیتے ہیں ان کے تمام ناولوں میں گھریلوں زندگی محور اور مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔انھوں نے تعلقات کے تذکرے سے ہمیشہ پرہیز کیا۔جنس و جنسیات ان کے نزدیک ایک عفریت ہے۔اس سے محض ذکر سے بھی انہیں خوف آتا ہے۔ان کے ناولوں میں شروع سے آخر تک تصنّع کی چھوٹ ہے۔راشدالخیری کی ناول نگاری کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ تبلیغی انداز اختیار کر لیتے ہیں۔سنبل نگار شرر کے تعلق سے فرماتا ہے۔

''شرر کی کردار نگاری کمزور ہے لیکن اس سے بھی بڑا وہ تبلیغی جوش ہے جس نے ان کے فن کو نقصان پہنچایا۔'' [1]

انھوں نے ناول نگاری کے میدان میں اپنے قلم کے جوہر دکھلائے اور اپنے ناولوں کی بدولت مصورغم کہلائے۔ان کے ناولوں کا انجام اکثر و بیشتر حالات میں المناک ہوتا ہے۔مگر ان کی جزئیات نگاری کھوکھلی جذباتیت کا شکار ہے۔مجموعی اعتبار سے انھوں نے ناول کے فن کو ترقی دینے میں نمایاں حصہ نہیں لیا۔مگر زبان و بیان کے لحاظ سے ان کے ناول زندہ و جاوید رہیں گے۔منشی سجاد حسین نے سرشار کے فن پر مبنی ناول نگاری کی جیسا کہ ان کے ناول ''حاجی بغلول'' اور ''طرحدار'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے فسانہ آزاد کی روشنی میں اپنے یہ دونوں ناول تخلیق کئے ہیں۔ان

[1] : اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، سنبل نگار، لکھنؤ ۲۰۰۹ء، ص ۸۵

کے ناول مذہبی اور سیاسی تعصّبات اور ذہنی حد بندیوں سے آزاد ہیں۔اس طرح ناول نگاری کے اس تقلیدی دور میں راشد الخیری اور منشی سجاد حسین نے ایک خاص روش سے متاثر ہوکر اپنا مخصوص رنگ قائم کیا۔جس کی وجہ سے انہیں ناول کی تاریخ میں اہم مقام حاصل ہے۔شرر اپنے تاریخی ناولوں کے لیے کافی مشہور ہیں۔ان کے ناول اسلامی تاریخ سے وابستہ ہیں۔ان کے مشہور ناول کچھ اس طرح ہیں۔ملک العزیز ورجینا ، شوقین ملکہ ،حسن انجلینا ،منصور موہنا ،فردوس بریں ،عزیز مصر ،فلورنڈا فلورنڈا ،فتح اندلس ،زوال بغداد،اور ایام عرب وغیرہ ہیں۔مولانا کی تخلیقات تعداد کے اعتبار سے بہت ہیں اور بقول فراق گورکھ پوری:

''وہ مٹی کے پہاڑ سہی لیکن آپ کو انہیں ٹھنک کر دیکھنا ضرور پڑے گا۔''[1]

اس کے بعد محمد علی طیب نے شرر سے حد درجہ متاثر ہوکر ناول لکھے ہیں۔ان کے ناولوں میں شرر کے فن اور اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔جس طرح شرر نے مسلمانوں کے کارہائے نمایاں کو یاد دلا کر عہد حاضر کے زوال کے اسباب پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی اس طرح محمد علی طیب نے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے پند و نصائح اور لمبی تقریروں پر مشتمل ناول لکھے جس نے ان کے فن کو نقصان بھی پہنچایا ہے۔محمد علی طیب کے بعد ان دنوں جن لوگوں نے ناول نگاری کے ذریعہ قوم وملت کی اصلاح کی ہے ان میں سجاد حسین کسمنڈوی آغا شاعر، ریاض خیر آبادی، شاد عظیم آبادی، احمد علی

[1] : بحوالہ علی عباس حسنی، اردو ناول کی تاریخ وتنقید، لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۲۳۲

شوق، اور قاری سرفراز حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔

مجموعی طور پر ان لوگوں کی ناول نگاری نصف بیسویں صدی پر ہی محیط ہے۔ان لوگوں نے اپنے ناولوں میں خاص معاشرے کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرکے ناول نگاری کو اوج ثریا پر پہنچادیا ہے۔ان لوگوں نے مختلف قسم کے ادبی اور شاعرانہ وسیلوں سے کام لے کر اجتماعی زندگی کے مختلف مسئلوں کے موضوع پر ناول لکھ کر قوم وملت کے اصلاح کی خدمت انجام دی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نذیر احمد، سرشار، راشدالخیری، محمد علی طبیب ،منشی سجاد حسین ، آغا شاعر، ریاض خیرآبادی اور قاری سرفراز حسین کے ناولوں میں زندگی کا تنوع پھیلاؤ اور گہرائی و گیرائی کا عنصر ملتا ہے۔ ان کے ناول رسوا کی طرح اخلاقی زوال کی فضا میں گہری معنوی تعبیر وتفہیم کے حامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ رہی ہے کہ ان لوگوں کے ناولوں میں فنی نزاکتوں کی کمی نہیں بہتات بھی نہیں مگر ایک بات ضرور ہے کہ ان لوگوں کی تحریریں فنی شعور کی روح رواں ضرور ہیں۔ اس کی مثال ہمارے سامنے ’’امراؤ جان ادا‘‘ ’’’خوب ہستی‘‘ ’’ہیرے کی کنی‘‘ ’’نقلی تاجدار‘‘ ’’ناہید‘‘ اور ’’ارمان‘‘ ہے۔جس کی وجہ سے اردو ناول نگاری میں نفسیاتی اور تجزیاتی ناول کی ابتداء اور شاعرانہ تخیل کا فروغ ہوا۔

انیسویں صدی کی ناول نگاری

آغا شاعر نے اپنے ''ارمان'' ''ہیرے کی کنی'' اور ''نقلی تاجدار'' جیسے اہم ناولوں میں بیسویں صدی کے ناول کے شعور کا گہرا ثبوت دیا ہے۔ یہ ان کے طبع زاد ناول ہیں انہوں نے اپنے ناولوں میں بیسویں صدی کے مسلم گھرانوں کے معاشرت کی بھرپور عکاسی کر کے اس عہد کے رسم ورواج اور روایت کو بروئے کار لائے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں عوام الناس کے نفسیاتی مسائل کو بڑی فنکاری اور چابکدستی سے پیش کرنے کی مساعی جمیلہ کیا ہے۔ پریم چند اس عہد کے ناول نگاروں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ سدرشن، محمد مہدی تسکین، قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحپوری، کشن پرشاد کول، ل احمد وغیرہ نے بھی اپنے ناولوں میں اس عہد کے مسائل کو حالات ااور نزاکت کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ عزیز احمد نے ناداری اور شہر میں رہنے والوں کے جنسی رشتوں کو قلم بند کیا ہے۔ ان کی ناول نگاری کے متعلق تنقیدی گفتگو اگلے باب میں ہوگی۔ قاضی عبدالغفار نے ایک ممتاز نثر نگار اور اعلیٰ پائے کے اہل قلم کی حیثیت سے پوری ادبی دنیا سے اپنا لوہا منوایا۔ ''لیلیٰ کے خطوط'' مجنوں کی ڈائری ''عجیب'' تین پیسے کی چھوکری'' جیسی داستانوی اور افسانوی کتابوں میں رومانی انداز کی نثر کا لطف تو ملتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ ان کتابوں میں طنز کا تیر ونشتر بھی چلایا گیا ہے۔ انہوں نے رومانوی انداز کی ہی نثر

نہیں لکھی ہے بلکہ ان کا قلم سنجیدہ عنوانات پر بھی پوری روانی کے ساتھ چلتا ہے۔

ناول کے آغاز میں رومانی تحریک کا ہر طرف جادو نظر آتا ہے۔ اس تحریک سے متاثر ناول نگاروں کے یہاں فن اور تکنیک کے جو نمونے سامنے آئے، وہ ان کے حقیقت پسند معاصرین سے مختلف ہیں اور افسانوی اظہار کی ان شکلوں کو پیش کرتے ہیں جن میں معاشرے سے زیادہ فرد، حقیقت سے زیادہ تخیل، سادگی بیان سے زیادہ آرائشی اظہار اور کردار نگاری سے زیادہ جمالیاتی کیفیتوں سے معمور مبہم شبیہ نگاری پر زور دیا گیا ہے۔ اردو کے اس دور کے ناولوں کا فنی معیار مغربی ناولوں کی طرح زیادہ بلند نہیں ہے اور ان کی مقبولیت بھی بہت جلد دھندلا گئی لیکن وہ ہمارے افسانوی ادب کی تاریخ کی ایک اہم کڑی ضرور ہیں۔

فسانہ آزاد کی طرح ''امراؤ جان ادا'' کا پس منظر بھی لکھنو کا زوال آمادہ معاشرہ ہے انہوں نے اپنے عہد کے لکھنو معاشرے کی تصویر کشی کی ہے۔ مرزا ہادی حسن رسوا علم ریاضی کے ماہر اور انسانی جذبات کے نبّاض تھے۔ ان کے ناولوں پر ان کے طبعی رجحان کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ ان کے ناولوں میں جنسیات سے لے کر سیاست تک کے سارے رجحانات فنی بصیرت سے لبریز نظر آتے ہیں انہوں نے ناول ''امراو جان ادا '' لکھ کر انسان کو یہ بتایا کہ انسانی زندگی کے پیچھے تہذیب معاشرت، سیاست، معشیت، اخلاق اور تاریخ کے حقائق پوشیدہ ہوتے ہیں جس کا مطالعہ کرنے سے ہم ماضی سے آشنا

ہوتے ہیں اوراس کی روشنی میں اپنے مستقبل کوسنوارتے ہیں۔اس کے بعد ناول نگاری میں مرزا سعید وغیرہ کا نام آتا ہے۔

مذکورہ بالا بنیادوں پر ہی اردو کے مایہ ناز ناول نگار پریم چند نے ناول نگاری کا تاج محل تعمیر کیا اور اس کی آبیاری کر کے ناول نگاری کے کارواں کو آگے بڑھایا۔ پریم چند نے اس دور میں ناول لکھنا شروع کیا جب کہ ''خواب ہستی'' امراو جان ادا'' منظر عام پر آ چکے تھے۔ابتداء میں انہوں نے ہندو معاشرت اوراس کی پیچیدگی پر مبنی اصلاحی ناول لکھے، ان ناولوں کا پس منظر ایسے معاشرے کو بنایا جن کا خود انھوں نے مشاہدہ کیا تھا۔اس طرح ان کے تمام ناول حقیقت اور صداقت کے غماز ہیں جہاں ان کے شدید جذبات اور غیر منطقی جانب داری کو خاص دخل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ابتدائی ناولوں کوفنی طور پر کامیاب نہ بنا سکے جس درجہ کے ان کے ناول ''بازارحسن'' گوشہ عافیت'' ''میدان عمل'' اور'' گئودان'' ہیں۔ پریم چند کے ناول خاص طور سے ''گئو دان'' اور'' میدان عمل'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناول نگاری کے فن کی جس روایت کو نذیر احمد، سرشار شرر، رسوا اور مرزا سعید نے قائم کیا تھا اسے پریم چند نے فنی اعتبار سے مزید وسعت اور گہرائی بخشی۔ وقار عظیم نے پریم چند کی ناول نگاری پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

''پریم چند کے ناول اردو ناول کی تاریخ میں زندگی اور فن کی عظمت اور

بلندی کے بہترین مظہر ہیں۔ پریم چند سے پہلے اچھے اچھے ناول نگاروں نے فن کی جو روایت قائم کی تھی، پریم چند نے نہ صرف اسے وسعت دی بلکہ اپنی فنی بصیرت سے اسے ایک نیا مفہوم دیا اور اسے ایسے امکانات کا حامل بنایا کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کا کوئی موقع اور فکر، احساس اور جذبے کی کوئی پیچیدگی اس کے لیے بے گانہ نہیں رہی۔'' [1]

سرشار عمیق مطالعہ رکھنے کے باوجود انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کا محاصرہ کر سکے اور نہ ہی لازمی، غیر لازمی اہم اور غیر اہم میں فرق قائم کر سکے۔ پریم چند کے ناول معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی گوشوں کا اس طرح محاصرہ کرتے ہیں کہ ان کے ناول ان تمام چیزوں کے ساتھ ہی ایک خاص قوم کے خارجی پہلو کے ساتھ ساتھ ان داخلی کیفیتوں کی اس طرح عکاسی کی ہے اس قوم کے جسم اور روح دونوں کے فرق عیاں ہو گئے ہیں اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے ناول ہندوستان کے شہروں دیہاتوں کے نچلے اور متوسط طبقوں کی تہذیبی اور قومی الجھنوں اور کشیدگی کے آئینے ہیں۔ پریم چند کے ناول اردو ناول کی تاریخ میں زندگی اور فن کی عظمت اور بلندی کے بہترین مظہر ہیں۔ ان میں سب سے پہلے کے ناول نگاروں نے فن کی جو روایت قائم کی تھی اسے انہوں نے وسعت ہی نہیں کی بلکہ اپنی فنی بصیرت سے ایک نیا مفہوم دیا۔ پریم چند کے ناولوں میں جہاں مارکس اور ٹالسٹائی کے نقطہ نظر کو دخل ہے وہیں قدامت پسندی یا مشرق پسندی بھی غالب ہے۔

[1] : وقار عظیم، داستان سے افسانے تک،

اس طرح پریم چند کے بعد جن لوگوں نے فن اور فلسفہ حیات، پر مبنی ناول نگاری کی اور اردو ناول کو فنی اعتبار سے آگے بڑھایا ان میں سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، عزیز احمد، کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

ترقی پسند ناول نگاری

ترقی پسند تحریک کے ادیبوں نے مارکسزم اور موجودہ سائنس اور سماجی علوم کی روشنی میں اپنا اظہار خیال کیا۔ ان لوگوں کا مقصد سماجی اصلاحی تھا اور اس کام کو ان لوگوں نے ایک جذبہ امید اور پروگرام کے تحت بخوبی انجام دیا۔ اس کا پرچار ان لوگوں نے اردو ادب میں افسانہ لکھ کر کیا یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے ترقی پسند تحریک کا رویہ زندگی کے بارے میں صداقت پر مبنی تھا۔ سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور عزیز احمد اس زمانہ کے ناول نگار تھے۔ ان بزگوں میں سوچنے سمجھنے اور اظہار خیال کا انداز جداگانہ تھا۔ یہ لوگ درمیانی طبقہ کے لوگ تھے قدامت پرستی رسم رواج اور اخلاقی بندھنوں کی چہار دیواری میں قید تھے جس کا مستقبل تاریک ہی تاریک نظر آرہا تھا۔ جس کا احساس ان لوگوں کو شدت سے تھا کہ یہ طبقہ برباد ہونے جارہا ہے۔ یہ طبقہ اپنے قدیم رواج کی ڈوری میں جکڑا ہوا شاید ہمیشہ رہ جائے اور اس کا پھر بہت برا ہو جائے آخر کار

انہوں نے اس طبقہ کے لوگوں کو تعلیم کی دعوت دی انسانیت اور جدید قدیم کے موضوع پر نہایت ہی خلوص ومحبت کے ساتھ تبلیغ کی۔ یہ تبلیغ ان لوگوں نے تحریری اور تقریری دونوں طرح سے کی۔ ان لوگوں نے جدید سائنس کی روشنی میں اچھے مواد اور فن کی کسوٹی پر ناول نگاری کر کے متوسط طبقہ کے لوگوں کو بیدار کیا جیسا کہ سجاد ظہیر نے ناول ''لندن کی ایک رات'' میں اپنے دانشورانہ جذبات واحساسات اور داخلی اظہار خیال کی تکنیک سے تخلیقی حسن کو پیراہن بخشا۔ یہ ناول سجاد ظہیر کی وہ نثری کاوش ہے۔ جو ۱۹۳۸ء سے اب تک مسلسل شائع ہوتی رہی ہے ناولٹ کے متن اور مواد کی اہمیت کی پیش نظر تنقیدی ایڈیشن بھی سامنے آتے رہے ہیں۔ یہ ناول اردو میں فنی نقطہ نظر سے جدید ناول کی قسط اول ہے۔ لندن کی ایک رات ترقی پسند ادب کا ابتدائی نمونہ ہے۔ یہ ایک ایسا ناول ہے جو ۱۹۶۵ء سے پہلے لکھے جانے کے باوجود آج کے نئے زمانے سے بھی نہ صرف جڑا ہوا ہے بلکہ عکاس اور آئینہ دار بھی ہے کیونکہ آج بھی مغربی دنیا میں تعلیم حاصل کرنے والے طالب علموں کے مسائل زیادہ بدلے نہیں ہیں۔ تو عصمت چغتائی نے تحلیل نفسی کے ذریعہ شمن کے کردار کو اجاگر کیا اور گاؤں کے گھروں میں استعمال ہونے والی روزمرہ کی بول چال کو اردو ادب میں ادبی مقام بخشا۔ کرشن چندر نے خلقت کی ابدی حسن کے گود میں سماج کے مختلف طبقہ میں ہونے والے ظلم وستم انسان کی پریشانی اور بے بسی کے پردہ کو فاش کیا تو عزیز احمد نے تعلق دارانہ مشنری اور متوسط طبقہ کے سماج میں عام لوگوں کی

تنگدستی اور دیگر بدحالی کو اپنا موضوع بنایا۔ ان لوگوں کی ناول نگاری سماجی مسائل پر مبنی اعلیٰ شاہکار ہے جس کے ذریعہ عام لوگوں کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ خواہ غریبی ہو یا باہمی کشیدگی یا ایک دوسرے پر ظلم وستم کے واردات۔ ہر مسائل اور مسائل کے حل کو اپنے ناولوں میں قلم بند کیا مگر پریم چند کے ناول ''گئو دان'' کی طرح نشان حیات کا ہمہ جہتی رزمیہ نہیں۔ بہر حال ان لوگوں کا ناول فن اور اسلوب کے لحاظ سے بہت دلکش اور دلچسپ ہے۔ جس کا نذیر احمد یا پریم چند کی ناول نگاری میں سراغ نہیں۔ ان ترقی پسند ادیبوں کے دل میں قوم کا درد تھا۔ جو کچھ دیکھا اس کو محسوس کیا اور ناول کے سانچے میں ڈھال دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی ناول میں صداقت پر مبنی کردار ملتے ہیں۔ ان لوگوں کے ناول میں صرف اقربا پروری قدیم عقائد اور زمانے سے چلی آنے والی رسم و رواج کی کشمکش اور پیچیدگی ہی نہیں بلکہ آزادی، انصاف اور انسان دوستی کے نئے ادارے، نئی دنیا کی تلاش اور نئے خوابوں کی تعبیر بھی نظر آتی ہے۔ اعظم راؤ نعیم، شمسا، سب کسی تعبیر کے خلاف رواں دواں نظر آرہے ہیں عصمت چغتائی نے اس عہد کے افسانوی ادب کے کرداروں کو یوں پیش کیا ہے۔

''نئی دنیا کا نیا بیٹا ضدی۔ بدمزاج اور اکھڑ ہے وہ موجودہ نظام کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنے نئے نظام کے لیے بیکل ہے۔ وہ اسے بدل ڈالنا چاہتا ہے مگر ابھی تو وہ بدنظمی سے متنفر ہو کر اپنی ہی بوٹیاں چبائے جا رہا ہے خود اپنا ہی جسم اپنی ہی روح کو چیر کر

پھینک رہا ہے''۔[1]

اس بات سے کسے انحراف ہے کہ انگریزی دور حکومت میں ہندوستانی عوام غلامی کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تھے۔ بڑے لوگ مزدور طبقے کو استعمال کرنے کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کرر ہے تھے۔ اس بدعنوان حکومت کی بدنظمی جارحانہ رویہ قید و بند کے نظارے متزلزل اونیم مردہ حالات ان ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ مجاز کی نظم ۔'' آوارہ'' میں ہیرو کا کردار اسی نوعیت کا ہے۔ جب ترقی پسند ادیبوں کے علاوہ گاندھی، جناح اور دوسرے رہنماؤں کے خون پسینہ کے صدقے ہندوستان آزاد ہوا تو ہندوستانیوں کے لئے جسمانی اور روحانی دونوں آرام کوسوں دور ہو گئے۔ مذہب کے نام پر نفرت بغض و کینہ، فسادات، قتل عام اور حیوانیت کے خوفناک رویہ کا آغاز ہوا تو ترقی پسند ادیب خوشگوار آزادی کا یہ نتیجہ دیکھ کر خوف سے چیخ پڑے۔ ایسے موقع سے کرشن چند رنے ''غدار'' سا ور راما نند ساگر نے ''اور انسان مرگیا''، تخلیق کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ اس کے علاوہ ایسے موقع سے ادیبوں نے بے شمار افسانے اور ناول تخلیق کر کے اس کے پس منظر میں اخوت، مروت، انسان دوستی، بھائی چارگی، قومی یکجہتی کی تلقین کی۔ اس سے قبل کے افسانوں میں فکر کی گہرائی اور تنظیم کا فقدان ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ناول ناول اور افسانہ افسانہ کہلانے کا مستحق نہیں دراصل وہ دور ہی بحران اور خلفشار کا دور تھا ان ادیبوں کا فرض تھا کہ فوری طور پر

[1] : عصمت چغتائی، ٹیڑھی لکیریں

حالات کو قابو میں لاکر ماحول سازگار بنائیں ۔ البتہ ایسے وقت میں ان لوگوں نے جذبات سے کام لیا جس کی وجہ سے ان لوگوں کی تخلیق میں فکر وفن کی کمی نظر آتی ہے ۔

طبقاتی کشمکش اور ناول

بہر حال پرچم آزادی کے تلے ظلم وستم مذہب کے نام پر فرقہ وارانہ فسادات اور مختلف قسم کے واقعات رونما ہوئے ۔ اس کی برقی رونے دل ودماغ کو جھنجھوڑ ڈالا اس کے دو نتائج برآمد ہوئے اول کچھ لوگ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے دوسرا ہندوستانی سماج میں جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہوا۔ ظلم وزیادتی کی دیوار گر گئی اور عام لوگ خوشگوار زندگی گزارنے لگے ۔ اس عہد میں قاضی عبدالستار اور انور عظیم جیسے ناول نگاروں نے جاگیردارانہ نظام کے خلاف ناول لکھا ۔ ان کا ناول ''شب گزیدہ'' اور '' دھواں دھواں سویرا'' اس امر کی عمدہ مثال ہے ۔ اور قرۃ العین حیدر کا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' سے بھی اس بدعنوان نظام کا شیرازہ بکھرنے کی گونج سنائی دیتی ہے ۔ ساتھ قاضی عبدالستار اور انور عظیم نے اپنے ناول میں تاریخی وطبقاتی شعور کے مطالعہ و مشاہدہ کے ذریعہ اس جارحانہ نظام میں ہونے والے ظلم وستم اور عام انسان کی محنت کا استحصال کی داستان بہت ہی موثر اور فنی چابک دستی سے قلم بند کیا ہے ۔ بیسویں صدی کے ناول

نگاروں میں خان محبوب طرزی بھی ناول نگار کی حیثیت سے منفرد مقام رکھتے ہیں۔

انہیں دنوں ہندوستانی کاروبار اور تجارت کے ذریعہ معاشی زندگی کو خوشگوار بنانے کی کوشش میں سرگرداں تھے۔اس میں کئی طبقے کے لوگ تھے خاص طور سے مزدور اور درمیانی طبقہ کی حالت دگرگوں تھی۔ان کے سامنے مسائل کے انبار لگے ہوئے تھے جن مسائل سے ان کا چولی دامن کا رشتہ تھا۔اس طرح وہ لوگ مالی بحران کے باعث غربت کے شکار ہو رہے تھے۔آزادی کے آفتاب کی خوشگوار شعاعیں سرمایہ داروں ،اسمگلروں ،بدعنوان افسروں ،ڈھونگی سیاسی رہنماؤ ں کے شبستانوں کو معمور کر رہی تھی۔غریبوں کا استحصال ان کا نصب العین تھا۔ان کی خواہش تھی کہ یہ نچلہ طبقہ ترقی کے راستے پر کبھی گامزن نہ ہوسکے۔ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں تنزلی پر گامزن رہے۔اس کارہائے نمایاں کوجن ترقی پسندادیبوں نے انجام دیااس دردناک زندگی کواپنے تخلیق کا موضوع بنایاان میں ہنس راج رہبر،مہندر ناتھ کرشن چندر،رضیہ سجاد ظہیر،سہیل عظیم آبادی وغیرہ کے اسم گرامی اہمیت کے حامل ہیں۔پر یڈگراونڈ’’بندگی‘‘رہبر کے درد کا رشتہ’’سورج ریت اور گناہ‘‘ مہندر ناتھ کے ناول سے سماجی ماحول کی پرتو ایسی جلوہ گر ہوئی ہے جس کا دیگر اردو ناولوں میں موہوم سا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ان کے ناول گاؤں اور قریہ کے مزدور افلاس و بھوک اور بے روزگاری کے ستائے ہوئے افراد نظر آتے ہیں۔ان کی زندگی گندے اور غیر کشادہ جگہوں میں بسر ہوتی ہے مگر وہ مظلوم امید کی خوشی

کے ساتھ خوشگوار طریقہ سے زندگی بسر کرنے کا خواب دیکھتا ہے۔اس کو حاصل کرنے کے لیے ہر ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ یہاں میں مہندر ناتھ کے ناول ''سورج'' ریت اور گناہ سے عبارت نقل کررہی ہوں جواسی نوعیت کی چیز ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ہیروئن انوری میری سے کہتی ہے۔'' [1]

''دھوپ کتنی تیزی سے ہماری طرف آرہی ہے میری جب تک انسان میں زندگی ہے اسے لڑنا چاہئے۔ دیکھوتو یہ سمندر کا شفاف سینہ پاکیزہ ہوا۔ ناریل کے درخت یہ لہریں یہ سورج، یہ ریت ہمارا تمہارا گناہ یہ کھلی فضا اور یہ راحت بخش ہوا جو پھیپھڑوں میں جاتی ہ ءہم کیوں نہ زندہ رہیں اورایک بہتر زندگی کے لئے لڑیں۔''

ان ناولوں میں محنت کش مزدور کے حالات زندگی کوانہی کی نظر سے دیکھا اورقلم بند کیا گیا ہے۔ یہاں ناول میں ناول نگار نے خودکو ناول کا کردار بنا کر پیش کیا ہے جس سے ان کی شخصیت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ ناول نگاراسی محنت کش دہقان کے دل ودماغ سے سوچتا اورانہیں کے عام بول چال کی زبان میں اظہار خیال کر کے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ چنانچہ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ پریم چند کی ناولوں کے اثرات ان بزرگوں کے ناولوں میں سیر وتفریح کرتی نظر آتی ہے۔ جو اردو کے دیگر ناول نگاروں نے انجام دیا ہے۔ بحثیت ناول نگار موصوف کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے اپنے ناول ''صورت الخیال'' میں ایرانیوں، انگریزوں اور ہندوستانیوں، دیہاتی

[1] : ناول: ریت اور گناہ، ص ۱۱

انسانوں کی زبانیں مقوم ومحفوظ کر دیئے ہیں۔ جو اردو ناول نگاری کی ارتقاء میں سنگ میل کا حکم رکھتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی اردو دنیا کے علاوہ انگریزی ہندی کے میدان میں تعارف کے محتاج نہیں۔ افسانہ نگاری کے میدان میں جو مقام ان کو حاصل ہے۔ کسی اور کو میسر نہیں ان کی ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' کی شہرۂ آفاق ہونے کی پوشیدہ بات اسی صداقت میں مخفی ہے۔ بقول نورالحسن نقوی:

''راجندر بیدی ایک مختصر سا ناول بغل میں دبائے اردو ناول کی دنیا میں داخل ہوئے مگر ایک دائمی نقش چھوڑ گئے۔''[1]

بیدی نے اپنے ناول کے کرداروں میں جان ڈالنے کے لئے اپنی ہستی کو انہی مظلوم کسانوں کے درد و کرب میں محو کر دیا ہے۔ بیدی کی یہ ناولٹ گئو دان کی طرح پنجاب کے دیہی علاقے کی منظر کشی کرتا ہے۔ جہاں غریب مزدور محنت کر کے روزی روٹی حاصل کرتے ہیں۔ وہ تہذیبی ماحول کی منظر نگاری کے ساتھ ساتھ کرداروں کی تہ داری کو بھی ڈرامائی انداز سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بہر حال یہاں ''لہو کے پھول'' حیات اللہ انصاری کے ناول کا ذکر کرنا غلط نہیں ہوگا۔ موصوف کا ناول ''لہو کے پھول'' بیسیوں صدی میں ہندوستان کی تحریک آزادی پر مبنی ہے۔ حیات اللہ انصاری اجتماعیت سے خفگی کے بعد بھی ترقی پسند نظریہ ادب سے منہ موڑ نہ

[1]: تاریخ ادب اردو، نورالحسن، علی گڑھ ۲۰۰۳ء، ص ۳۳۱

سکے۔انہوں نے ناول میں انسانی زندگی اورتحریک آزادی کا جس پیمانہ پرمطالعہ ومشاہدہ کیا وہ ایک خاص سیاسی اورسماجی نقطہ نظر کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر ''لہو کے پھول'' پراظہارِخیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

آزادی کے بعداردوناول

''لہو کے پھول'' اردوفکشن میں ایک اضافہ تصور کیا جاتا ہے۔اس ناول میں حیات اللہ انصاری نے جدوجہد آزادی کی پوری تاریخ کوافسانوی انداز میں سمودیا ہے۔ یہ جدوجہد آزادی کی ایک دل چسپ اورقیمتی دستاویزاورایک یادگارادبی کارنامہ ہے۔'' [1]

انہوں نے اپنے ناولوں میں ہندوستانی عوام اوران کی کوششوں کو بڑے ہی مفکرانہ اوردانشورانہ انداز میں رقم کیا ہے۔ ویسے ان کا یہ ناول بہت ضخیم ہے جس میں مصنف بےضرورت وسعت پیدا کر کے قصہ کوطول دے دیا ہے۔ یہ چیزیں ناول کوغیر متوازن بنادیتی ہیں۔ پھربھی یہ ناول اشتراکی تحریکوں اوردیہاتوں کے ماحول سے تعلق رکھنے واکے اردو کے شہرت یافتہ اورمقبول ناولوں کی فہرست میں شمار کئے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی ناولٹ ''گھروندہ'' اور''مدار'' ہے جس میں ''گھروندہ'' کافی طویل ہے اس کا قصہ یوں ہے کہ ایک بڑے گھر کالڑکا ایک بیراگن کے شباب پرعاشق

[1] : تاریخ ادب اردوعہدمیر سے ترقی پسندتحریک تک، جلد چہارم، پروفیسر سیدہ جعفر، حیدرآباد، ۲۰۰۲ء، ص ۸۷

ہو جاتا ہے۔کافی دشواریوں کے بعدلڑ کالڑ کی شادی کر لیتے ہیں اس کے بعد دونوں کے درمیان تہذیب وتمدن کا مسئلہ کھڑا ہوتا ہے۔مگر دونوں اپنے اپنے تہذیب وتمدن پر ہی اٹل رہتے ہیں جو روایت ایک دوسرے کے جداعلی سے چلی آرہی تھی۔ناولٹ ''مدار'' کے ذریعہ حیات اللہ انصاری مادری زبان کوترجیح دیتا ہے۔اس نے ثابت کیا ہے مادری زبان کا رشتہ اہم ترین رشتوں اور جذبوں پر افضلیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد پاکستانی ادیبوں نے بہت زورشور سے ناول لکھے ہیں جو اچھوتے موضوع فن تکنیک اورفکری احساس پر مبنی ہے مگر حالات حاضرہ کے مسائل کو جنہوں نے اپنے ناول کے لئے موضوع کا مرکز بنایا یعنی عام انسانوں کی سماجی زندگی میں آئے دن جو واردات رونما ہوتی ہیں سیاسی ، معاشی ، اقتصادی مسائل کھڑے ہوئے ہیں ان کوتنقیدی نقطہ نظر سے صداقت کے پر لگا کر پیش کیا۔ان ناول نگاروں میں خاص طور سے خدیجہ مستور کا ''آنگن'' ،''اداس نسلیں'' عبداللہ حسین اور خدا کی بستی ، جانگلوس شوکت صدیقی کا خاص طور سے مشہور ومعروف ناول ہیں۔پہلے دونوں ناولوں کے ذریعہ آزادی سے قبل کی انسانی زندگی کومصنف نے بڑی چابک دستی سے پیش کیا ہے۔اور دونوں کا اختتام ملک کی تقسیم پر کیا ہے۔دونوں ناولوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آغاز سے اختتام تک ایک پائیدار نقطہ نگاہ ، تاریخی ، سماجی گہرائی و گیرائی کا سلیقہ پنہاں نظر آتا ہے۔خدیجہ مستور نے اپنے ناول ''آنگن'' کے ذریعہ ایک درمیانی درجہ کے مسلم

خاندان کے حالات بڑی منصفانہ انداز میں پیش کیا ہے۔وہ اس بات کی وکالت کرتی ہے کہ گھر میں جو چھوٹے موٹے واقعات نمو پذیر ہوتے ہیں وہ دراصل ملک ی اشترا کی زندگی میں پیدا ہونے والے مسائل کا مرہون منت ہے۔انگریزی حکومت کے خلاف جو لڑائی باہرلڑی جارہی تھی اس میں سپاہیوں کی مستقل مزاجی ، جوانمردی،موت اور تباہی کا سچا نظارہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

شوکت صدیقی نے اپنے دونوں ناولوں میں پاکستانی ماحول کی دگرگوں پیچیدہ حالات کو پیش کرنے کی جستجو کی ہے۔ پاکستان کے نصف جا گیردار ،نصف متوسط طبقہ اور سماج کے لوگ مذہب کی آڑ میں برملا ہونے والے جرم کی حمایت کرتے ہیں۔اور انسان کی ایک شہری ہونے کی حیثیت سے جو بنیادی حقوق ہیں ان کو نیست و نابود کرنے کی جو مہم چلی آرہی ہے شوکت صدیقی نے بڑی ہمت اور بہادری سے ناولوں کے الجھے ہوئے پلاٹ میں ان کو یکجا کیا ہے۔ان کا ناول ''خدا کی بستی'' میں ''سلمان'' سلطانہ نیاز ،علی احمد کے کردار اردو ناول کے مستحکم کرداروں میں انفرادی مقام رکھتے ہیں۔ جانگلوس میں پاکستان دیہاتی علاقوں میں حیوان صفت زندگی بسر کرتے ہیں۔اسی صورت حال کوموضوع بنایا ہے اور یہ بات غور طلب ہے کہ ایک لکھنوی ادیب دیگر زبان ، دوسرے تہذیب وتمدن ،رسم ورواج ، ماحول اور معاشرہ کی رنگارنگی انسانی زندگی اور نفیات کو دل کش اور موثر طریقے سے پیش کیا ہے۔لالی اور رحیم داداس ناول کا مرکزی

کردار ہیں جو جیل خانہ سے باہر نکل گئے ہیں اس طرح شوکت صدیقی نے اس ناول میں اس بات کی دلیل پیش کی ہے کہ اس سماج میں اصل مجرم جو گناہ گار ہیں وہ قید خانہ کے اندر نہیں بلکہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑے سیاست داں ہوتے ہیں اور حکومت میں بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔سید شبیر حسین نے اپنے ناول ''جھوک سیال'' میں ایک گاؤں کے آئے دن ہوئے واردات کو قلم بند کیا ہے۔مگر جانگلوس اس کے برعکس ہے۔ یہ ناول پورے پنجابی دیہاتی علاقے کی زندگی پر محیط ہے۔

ترقی پسندی کے علمبرداروں نے پرانے رسم و رواج جو رام طور پر صداقت پسندی پر مبنی تھے اس سے الگ ناول نگاری کے اصول وضابطے قائم کئے جیسا کہ خواجہ احمد عباس کا ناولٹ ''سیاہ سورج سفید سائے'' اس میں مصنف نے اشتراکی جمہوریت پر چلنے والے نو آبادی ملکوں کے خلاف جاگیردارانہ نظام کی جارحانہ ظلم وستم کا پردہ فاش کیا ہے۔خواجہ احمد عباس نے بھی حیات اللہ انصاری کی طرح ہندوستانی عوام اوران کی آزادی کی جستجو کو قلم بند کیا ہے۔اس کے علاوہ کرشن چند نے پوری کائنات کی جاگیردارانہ نظام کی جارحانہ ظلم وستم ،سماجی نا برابری،اعلی ادنی کا بھید بھاؤ،لوٹ کھسوٹ،خوشحال زندگی گزارنے کو اشارہ کنایہ کے ذریعہ بااثر بنا کر پیش کیا ہے۔انہوں نے دبے کچلے استحصال زدہ کشمیریوں کے بارے میں بہت کھل کر قلم بند کیا ہے۔ جیسے''گدھے کی سرگذشت''''الٹا درخت''اسی نوعیت کی تخلیق ہے جس میں

برائے نام عوامی یا جمہوری نظام کے کل شعبہ جمہوریت ، انصاف ، قانون اور سماجی رشتوں کے ریا کارانہ ومکارانہ رویہ پر سخت تیر چلایا گیا ہے۔شکست کی تکمیل اس زمانی پس منظر میں کی گئی ہے جس میں فرسودہ نظام معاشرہ سے ایک خوشگوار اور صحت مند انداز حیات ٹکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ہمارے پرانے شاستروں میں کیا کچھ نہیں ہے۔بجلی سے لے کر ہوائی جہاز تک اور ریل گاڑی سے لے کر مشین گن تک ہر ایک چیز کی ودیا موجود ہے۔ ہمارے رشیوں منیوں کو ان سب باتوں کا گیان تھا۔اب ان پرانے دھرم شاستروں کو پڑھنے والا کوئی موجود نہیں نہ ایسا وہ رشی منی ہے۔[1]

کرشن چندر نے کم وبیش پچاس ناول لکھے ہیں۔ان کے سماجی ناول کے غائر مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں مواد اور تکنیکی گونا گونی ہے۔''شکست'' کا موضوع محنت کش مزدور کا خون چوسنا اور جاگیرداروں کی رہنمائی میں فرقہ وارانہ فسادات کو فروغ دینا ہے۔کرشن چند نے ''جب کھیت جاگے'' تخلیق کر کے محنت کش مزدور کی زندگی اور حالات کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔اس میں باغی راگھو نے اپنی المناک استان زندگی میں بیان کی ہے جس کو دوسرے دن سولی پر چڑھایا جائے گا۔۔۔''مٹی کا صنم'' اور ''میری یادوں کے چنار'' کی تکنیک آپ بیتی ہے اس میں ناول نگار نے اپنی یادوں کے ذریعہ انگریزی دور حکومت کے ظلم وتشدد کو بیان کیا ہے۔۔۔دل

[1]: ناول شکست، کرشن چندر، ص ١٦٧

کی وادیاں سوگئیں بھی تکنیک کے اعتبار سے نہایت ہی اچھا اور دل چسپ ہے۔ایک مسافر ٹرین کے حادثہ کی وجہ سے چند دن بیابان جنگل میں گذارتا ہے جس کی رسائی سماج کی متعدد حلقوں سے ہے۔وہاں وہ اپنی شناخت دے کر اپنا مدعا کا اظہار کرتا ہے۔ دادر ریل کے بچے جو ممبئی کی اوسان خطا کر دینے والی زندگی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اس میں جاگیردارانہ نظام کی شیطانیت وحیوانیت کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔اس طرح ''ایک عورت ہزار دیوانے'' ''برف کے پھول'' جیسے ناول ہیں۔ یہ صداقت پرمبنی ہیں کرشن چندر کی حقیقت نگاری میں حقیقت کا پرتو کچھ گہرا نہیں یہ اور بات ہے مگر وہ اپنے آپ کو اس کے لئے کوشاں رکھتے ہیں مگر اسکے بعد بھی وہ اپنی ناولوں میں ہندوستانی سماج کی پناہ گزیں انسانوں کی زندگی اس کی پریشانیوں اور رویوں کو بڑی چابک دستی سے حصار کرتے ہیں۔ جو کسی دوسرے ناول نویس کو میسر نہیں۔

قرۃ العین حیدر اردو ناول کا ایک مستقل اور علیحدہ باب کہی جا سکتی ہیں۔انہوں نے ناول کے فن کو تازگی اور معنویت بخشی ہے۔ وہ ان کا ہی حصہ ہے انہوں نے اپنا پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' کے شروع میں اردو نوابوں ،تعلقداروں اور جاگیرداروں کی عیاشی معاشقہ رنگارنگ محفل کی اور آخر میں جنگ آزادی کی تباہی و بربادی افلاس ومصیبت کے المنا کی کی عکاس کے ہندوستانی مسلمانوں کے بگڑے ہوئے معاشی حالت کی اصلاح کرانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول اس دور کے اودھ کا سیاسی

،سماجی ،معاشی ،تہذیبی ، مذہبی تمام پہلو نمایاں کرتا ہے ۔ جہاں شرفاء ،روساء، معاشقے سیر وتفریح رقص وسرور ،شراب و شباب میں مگن گھر کے بجائے کلب میں پارٹی اور پکنک منا رہے ہیں ۔ساتھ ہی ادب آرٹ فلسفہ حیات کے ماہراور بورژ روایت ، پرولتاریت کا دلدادہ ہے ۔اس ناول میں ہندوستان کے متعدد تحریکوں کا سراغ وشعور روا دواں ہے ۔ ناول کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مصنفہ کوقوم پرست مسلمانوں کے گروہ سے حد درجہ محبت و انسیت ہے ۔ ان کا دوسرا ناول ''سفینۂ غم دل''ان کی اپنی آپ بیتی پر مبنی ہے ۔جس میں مصنفہ اپنے عزیزوا قارب کے ساتھ نظر آتی ہے ۔اس ناول کی ابتداء مصنفہ کی خاندانی معاشرت کی تاریخ اور اختتام تقسیم ہند پاک پر محیط ہے کہ جب ہندوستان میں انگریزی حکومت کے درمیان تحریکیں شروع ہوئی تو آئے دن کہیں نہ کہیں دنگا فساد، گورے اور ہندیوں کے درمیان کشیدگی ، سیاسی ،معاشی ، مذہبی ،اقتصادی ،تعلیمی بدامنی سے متاثر ہوکر مصنفہ مع اپنے خاندان کس طرح دردغم کو سینے سے لگا کر سخت سے سخت مراحل سے گزرکرا پنے بزرگوں کو پاکستان جاتے ہوئے دکھلاتی ہیں ۔

اس طرح مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دونوں ناول اودھ کے تعلقدار خاندان کی مکمل تاریخ ہے ۔جس میں ان کی معاشرت کی بھر پور عکاسی کی گئی ہے ۔جس معاشرت پر مغربی تہذیب کا اثر حد درجہ غالب ہے ۔ان کے ناول صداقت کی غمازی کرتے ہیں ۔ساتھ ہی مصنفہ کا سب سے شاہکار ناول '' آگ کا دریا'' ہے جس پر

ان کو گیان پیٹھ ایوارڈ ملا ہے۔ یہ ناول قومی یک جہتی کا ضامن اور اردو ناول کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔آگ کا دریا کا پلاٹ اس اقتباس سے ملاحظہ فرمائیں:

''موجوں کی موجیں گوم نیلمبر کے اوپر سے گذرتی چلی گئیں۔ابولمنصور کمال الدین نے کنارے پہنچ کر اپنا شامکرن گھوڑا برگد کے نیچے باندھا اور چاروں اور نظر ڈالی۔'' [1]

ان تمام ناولوں میں تخیل کارفرما ہے اس کے علاوہ ''کار جہاں دراز ہے''''آخر شب کے ہم سفر''''چاندنی بیگم ،گردش رنگ چمن''''ہاؤسنگ سوسائٹی (ناولٹ)'' جیسے ناول لکھ کر مصنفہ نے اردو ناول نگاری کے کارواں کو آگے بڑھایا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید کی ترجمانی قرۃ العین حیدر کے ناولوں ''میرے بھی صنم خانے''''آگ کا دریا''''کار جہاں دراز ہے''اور''آخری شب کے ہم سفر'' کے مطالعہ سے اول اول یہ بات سمجھ میں آئی کہ کوئی بھی ناول شاہکار کی حیثیت اسی وقت اختیار کرتاہ جب ناول نگار تخلیقی سطح پر اسے برتنے کا اپنا ایک خاص اسلوب تراشتا ہے۔ خواہ وہ اسلوبوہ طریقہ کار، مروجہ اسلوب اور طریقہ کار سے مختلف یا یکسر ہی برعکس کیوں نہ ہو۔اس اعتبار سے تخلیقی سطح پر ناولوں کو برتنے کے لیے دو متوازی خطوط پاتے ہیں۔ایک فنکارانہ اور دوسرا دانشورانہ۔فنکاری کی سطح پر ناول نگار ناول کے مروجہ لوازمات (ہیئت تکنیک وغیرہ) کو اپنے طور پر برتتا ہے اور منفرد تخلیقی قوت اور فنکارانہ بصیرت سے کام

[1] : آگ کا دریا، قرۃ العین حیدر، ص ۱۲۷

لے کر ہیئت تکنیک ،موضوع اور اسلوب میں نت نئے تجر بے کر کے ناول کے فنی امکانات کو وسیع سے وسیع تر کرتا ہے۔ دوسری جانب ناول نگار دانشوری کی سطح پر اپنے فن کے توسط سے موضوع یا موضوعات سے متعلق کردار یا واقعہ کے حوالے سے یا تو کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے یا پھر زندگی اور اس کی مختلف کروٹوں سے متعلق کہی ہوئی باتوں کے تناظر میں ان سے متعلق حقائق کیفیات اور حیات کی کچھ اس طرح نقاب کشائی کرتا ہے کہ قاری کو یہ فیصلہ کرنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ جو حقیقت اس کے سامنے ہے۔خود اس کی حقیقت کیا ہے۔فن کی تخلیق میں خصوصاً ناول کی تخلیق میں فنکاری کے ساتھ دانشوری کو بھی وقار و معیار کے ساتھ برتنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ فنکارانہ رچاؤ تو کوئی بھی شخص اور مطالعے کے ذریعے پیدا کر سکتا ہے۔لیکن دانشورانہ رچاؤ کے لئے ایک مخصوص ذہنی ساخت کی ضرورت ہوتی ہے جو شاعری میں صرف غالب اور اقبال کے ہاں نظر آتی ہے۔لیکن فکشن میں قرۃ العین حیدر ہی ہیں جن کے ہاں فنکاری ہی دانشوری کی بھی اعلیٰ ترین روایات ملتی ہیں۔''آخر شب کے ہم سفر'' متحدہ ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی بنیادوں پر اس خطے میں رونما ہونے والے سیاسی اور ذہنی انقلابات کی دستاویز ہے۔جس میں کہانی بنگال کی انتہاء پسند اور انقلابی تحریک سے شروع ہوتی ہے۔اور ''بھارت چھوڑو آندولن'' مطالعہ پاکستان اور تقسیم ملک کی منزلوں سے گذرتی ہوئی بنگلہ دیش کے قیام تک پہنچتی ہے۔اس دوران ان کی کہانی مختلف موضوعات کی بناء ان گنت

واقعات کو اپنے بہاؤ میں لے کر آگے بڑھتی ہے۔ یہ واقعات اس خطے کی سیاسی کروٹوں کو بھی آشکار کرتے ہیں اور نئی اور پرانی تہذیبوں کے تصادم کو بھی۔ ان میں رومان اور محبت کی دھیمی دھیمی آنچ بھی ہے۔اور وحشت اور بربریت کے گھناؤنے خنجر بھی۔مثلاً دیپالی سرکار کا اپنے ہی گھر میں نقب لگانا سیاسی مقاصد کے لئے نواب قمر الزماں چودھری اور اس کے اہل خاندان کا قتل کماری امارائے کی ریحان الدین احمد کے لئے تڑپ اور کسک۔ یہ اور ان جیسے واقعات ناول کو اس کے فن سے بڑی حد تک باندھے ہوئے رکھتے ہیں۔لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ''آخری شب کے ہم سفر'' واقعاتی ناول ہے بلکہ اس ناول میں سب سے زیادہ نمایاں اس کے کردار اور ان کرداروں کے اسرار ہیں۔مثلاً دیپالی سرکار، ریحان الدین احمد، کماری امارائے ، رچرڈ بارلو، نواب قمر الزماں، چودھری بھوتارنی دیوی، جہاں آراء، یاسمین، بلونت وغیرہ۔ ہر کردار اپنے اعمال پنے نصب العین اور مزاج کی بناء پر ایک منفرد کردار قرار پاتا ہے۔ جو سکڑتا ہے تو خود قرۃ العین حیدر کے فکر و فلسفہ اور جد و جہد، انسان دوستی اور حریت پسندی کی علامت بن جاتا ہے اور پھیلتا ہے تو پورے برصغیر کی سیاست، معشیت ،تہذیب اور ثقافت کو سمیٹ لیتا ہے۔مثال کے طور پر دیپالی سرکار ایک روایت پسند شریف ہندو خاندان کی فرد ہونے کے باوجود دہشت پسند تحریکوں میں شامل ہوجاتی ہے۔اور اپنے مقصد کے حصول کے لئے خود اپنے ہی گھر کو لوٹ کر اپنا ہی اثاثہ تحریک کی

نذر کر دیتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں کی طرح اپنے ناولوں میں بھی مروجہ تکنیک کی خلاف ورزی کے باوجود فضاء، واقعہ، کردار اور موضوع کو ایک ساتھ کچھ ایسے فنی رچاؤ کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جہاں پر واقعہ اپنی پوری شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے وہاں کردار دبتے ہوئے نظر نہیں آتے۔اور جہاں پر کردار پورے ناول کے وقار کے امین نظر آتے ہیں وہاں واقعہ پس منظر میں نہیں چلے جاتے بلکہ کردار اور واقعہ دونوں ایک دوسرے سے تحریک پا کر اس مخصوص دانشورانہ فضاء کو تشکیل دیتے ہیں جس پر قرۃ العین حیدر کا انحصار ہے۔''آخری شب کے ہم سفر'' پڑھتے ہوئے قدم قدم پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ واقعہ کردار میں اور کردار واقعہ میں رنگ بھرتے ہوئے چلتے ہیں۔

اردو ناولوں میں ذہنی بیداری

اس کے بعد جن ناول نویسوں نے اردو ناول نویسی میں شہرت حاصل کی ان میں جوگیندر پال ، انور سجاد درجہ اولیٰ کے مالک ہیں۔حال ہی کی عمدہ مثال ''فراد'' ''خضر ثانی'' ''نادیدہ'' اور ''بیانات'' جوگیندر پال کی ناولیں ہیں جو دیگر بیانیہ ناول سے مختلف علامتی کردار کے مالک ہیں۔وہ اپنے ناول میں تین اہم کردار کے ذریعہ پیش کی ہے جو ذہنی بیداری ہی نہیں مادی سماجی معیار پر وہ تین طاقتیں ہیں جو آپسی طور

پر کرا جانے ٹوالا ہے۔ایک طرف سائنس ٹکنالوجی کی عطا کی ہوئی میکانکی اور بناوٹی تہذیب ہے جو ناول کا کردار دلیپ کی بنجر زمین ہوگئی ہے تو دوسری جانب آرٹ ادب اور دیگر تخلیقی کارنامے ہے جس میں آج بھی انسانی قدر اور جذبہ نمایاں نظر آتا ہے۔اس تخلیق میں فنکارانہ نصیرت اس کی شناخت ہے اور اس ناول کی ہیروئن بذات خود زندگی ہیں۔''نادید'' بھی کچھ ایسی نوعیت کی چیز ہے۔آپ دیکھیں گے کہ ظاہری طور پر تو یہ چند نابیناؤں کی داستان ہے مگر جب آپ اس ناول میں اتر کر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ کچھ نابینا بصیرت والوں سے زیادہ وسعتِ نظر رکھتے ہیں۔

جوگندر پال کو عوام کی طاقت و دانائی پر بہت بھروسہ ہے۔وہ عام انسانوں کی دگرگوں حالت دیکھ کر پریشان رہتے ہیں۔ناول کی فنی اور جمالیاتی وقار کا سبب زبان و بیان کا خوش نما استعمال ہے۔اس ذریعہ سے جوگندر پال اپنے کرداروں کے روحانی تجربات میں قاری اور خود کو بھی شامل کرتے ہیں۔وہ اپنے ناولوں میں انسانی صورت حال میں معنی کی نئی سمتوں کی جستجو کرتے ہیں۔

''خوشیوں کا باغ'' اور ''جنم انوروپ'' انور سجاد کا ناول ہے۔وہ اپنے ناولوں میں اختیار کی روایت سے گریز کر کے ناول کے فن کو شاعری اور مصوری کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔اس اعتبار سے اردو ناول نویسی میں ان دونوں کو تجرباتی ناول کہہ سکتے ہیں۔حالانکہ قصہ یہ کہ انور سجاد کا اسلوب منفرد ہے۔عہد، مقام اور

کہانی کی ٹوٹ پھوٹ ان کے افسانوں کی طرح ان کے ناولوں میں بھی عیاں ہے۔اس بات کی صراحت شمیم حنفی اور دیگر عہد حاضر کے بڑے بڑے نقادوں نے کی ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انور سجاد کا تعلق ترقی پسند تحریک سے رہا ہے یا نہیں۔ مجھے اس بحث سے مطلب نہیں مگر ایک بات ضرور ہے کہ انور سجاد ایک نرم دل انسان تھے۔ وہ عام لوگوں سے محبت رکھتے تھے۔ وہ انسانی فلاح و بہبود کے لئے سماجی اور سیاسی دونوں اعتبار سے اپنے آپ کو لگائے رکھتے ہیں۔اس بات کی تصدیق مجھے ان کی ناول نگاری سے ہوئی ہے۔اس میدان پر وہ اپنے ہم عصروں سے اعلیٰ و بالا ہیں۔ وہ حالات حاضرہ کے بگڑے ہوئے سیاسی ، سماجی حالات ،ظلم و ستم ،زور زبردستی کئے جانے والی عوامل استحصال ،شیطانیت اور حیوانیت کے خلاف بہانگ دہل آواز بلند کرتے ہیں۔ان کا نثری اسلوب اتنا شاندار اور دل کش ہے کہ وہ اپنے اظہار خیال کے غرض و غایت مقاصد فکر نظر وہ کیا چاہتے ہیں اس کو اپنے قارئیں تک پہنچا سکتے ہیں مگر حیف کہ وہ حد درجہ الجھے ہوئے اور جز باتی تکنیک قلم بند کر کے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ۔ان کے ناولوں کا مطالعہ کر کے اس کو سمجھنا عام لوگوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔ایک گریجوٹ قاری جزوی طور پر سمجھ سکتا ہے مگر وہ بھی مرعوب ہو کر رہ جاتا ہے۔ دراصل انور سجاد جس الجھے ہوئے اور پیچیدہ مسائل کو اپنے ناولوں میں پیش کرنا چاہتے ہیں اسے کمال فن نہیں کہتے ۔اپنی بات کو کہنے کے لئے الجھے ہوئے تکنیک کا سہارا لے کر یہ کمال نہیں بلکہ

ایسی تکنیک اپنائے کہ عام قاری ان کے مرکزی خیال کو سمجھ سکے۔ اور تنقید وتبصرہ کر سکے۔

تاریخی ناول

اردو میں بیشتر تاریخی ناول قدیم اور پرانے رسم ورواج پر مبنی لکھی گئی ہیں ۔جس میں نقطہ نظر کو بہت دخل ہے۔ دراصل ابتداء میں تاریخی ناول کے ذریعہ ہی مذہبی عقائد کی تبلیغ کی جاتی تھی ۔اس کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اردو ناول میں ہیرو اور ہیروئین کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا جس کے نتیجے میں تاریخی ناول کی ترقی نہیں ہوئی۔ ترقی پسند ادیبوں نے اس کے لئے بھی کافی جدوجہد کی۔ ان بزرگوں کا خیال تھا کہ تاریخی ناول سماجی تاریخ پر مبنی ہو اور قومی یک جہتی، انسانی دوستی، اخوت ومروت اور بھائی چارگی کا ضامن بھی ۔اس اعتبار سے قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' کو تاریخی ناول کہہ سکتے ہیں۔ یہاں گذرے ہوئے زمانہ کا تہذیبی میراث اور فکری سرمایہ سے ان کا رشتہ کسی احیائی یا قدامت پسندانہ ذہنی رویہ کا ثبوت فراہم نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے برخلاف وہ بیتے دنوں کی روشنی میں موجودہ زمانہ کو پرکھ کر سازگار اور خوش گوار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اجتماعی طور پر ان کو اپنے ناول کا موضوع تاریخ بنانے کا مقصد جاگیردارانہ اور نا اہل طبقہ کے ظلم وستم کے خلاف صدائے احتجاج کرنے اور انسان دوستی کو دعوت دینے کا

ہے ۔ان تمام چیزوں کی تلاش انہوں نے متعدد تحریکوں اور فلسفوں کی روشنی میں مطالعہ و مشاہدہ کی بنیاد پر کی ہیں ۔ یہی چیز ان کی ناول کو شہرت بخشتی ہے ۔ قاضی عبدالستار اور احمد عزیز نے بھی اپنی تاریخی ناولوں میں زندگی کے وسیع تہذیبی اور انسانی رشتوں کو پیش کیا ہے ۔قاضی عبدالستار نے اپنے ناول ''داراشکوہ'' میں ہند و پاک کی تاریخ کے ایک خاص چوراہے پر رکھ کر مخالف طاقتوں کی صداقت پسندانہ مصوری کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ عہدہ وحکومت حاصل کرنے کے لئے جو جنگ لڑی گئی ایسے موقع پر ترقی پسند ادیب آن دشمنِ انسانیت گروہ کی طاقت کو ختم کرنے کے لئے معرکہ آراء تھے ۔انہوں نے اپنے ناولوں میں تقسیم ہند سے پیدا شدہ پیچیدہ ، اقتصادی ،سیاسی ،سماجی ،معاشی ،جغرافیائی اور ثقافتی مسائل کو خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے ۔

فی زمانہ ''جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں'' عزیز احمد کا ایک اہم ناول ہے ۔اس میں امیر تیمور کی سوانح حیات کو ایک کامیاب حکمراں کی جگہ ایک عام انسان کی طرح پیش کیا گیا ہے ۔اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک انسان جو بچپن سے جوانی تک کا سفر طے کر کے ضعیفی کو پہنچ کو جاتا اس وقت وہ انسان نرم دل ،سنجیدہ اور معلم اخلاق بن جاتا ہے ۔ساتھ ہی وہ اپنے بچپن اور جوانی کا تصور کرتے ہیں جس سے وہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکے ہیں ۔اس کے ساتھ ہی ناول نگار نے ان عوامی تہذیب وتمدن کا ورطاقتوں کی نشان دہی کی ہے جو قدیم ایشیاء کو نئی راہ دکھا رہی ہیں ۔

آزادی کے بعد ہند و پاک میں معاشی ،،سیاسی ،ادبی،تعلیمی اور دیگر شعبوں میں تبدیلی رونماء ہوئی۔خاص طور سے ادب کواس سے کافی نقصان ہوا۔ظلم وستم فسادات کے شکار لوگ ہجرت کے مصیبت ومسائل سے دو چار تھے۔یہ بہت نازک دور تھا۔یایوں کہا جائے کہ دستور زباں بندی تھی۔بہرحال اس ہیجانی صورت حال نے عرصہ دراز تک ادیبوں کو ذہنی تعطل کا شکار بنائے رکھا۔یعنی تحریری شکل میں اپنے ذہنی اظہار خیال سے محروم رہا۔آخر کار ایک مدت کے بعد ناول لکھا گیا جو ایک فلسفانہ اور فکری عمل تھا۔جوانسانی زندگی کے پائیدار حقائق کی تفہیم کے لئے گہری سماجی بصارت اور تجزیاتی قوت کا مطالعہ کرتا ہے۔ناول نگار اسی وقت اچھا ناول نگار ہوسکتا ہے جب وہ سماج میں رہنے والے انسانوں کے حالات ومسائل کا بغور مطالعہ کریں گے اس کا جائزہ لیں گے۔اس کے لئے مصنف کو اپنا قیمتی وقت عرصہ دراز تک لگانا پڑے گا۔بہرحال

اُردو میں ناولٹ میں آزادی کے بعد ناول نگاری سے متعلق بات کرنے کے حق میں ہوں جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ اسز مانہ میں عام لوگوں کے علاوہ ادیبوں کے ساتھ کیا دقت اور دشواریاں پیش آئیں کہ خاص طور سے ترقی پسند ادیب ایک موج خوں سے گذر گیا بعدازاں حالات سازگار ہوئے تو تخلیقی تحریک میں خوب ناول لکھے گئے انہیں دنوں ترقی پسند ادیبوں نے ہی ناولٹ کو خاص طور سے فروغ دیا۔جیسا کہ مشہور ہے کہ مصروفیت کے ساتھ انسان کے پاس وقت کا فقدان ہو جاتا ہے۔یہی حال اس زمانہ میں

بھی ہوا۔لوگ زیادہ سے زیادہ اپنے کاروبااور ملازمت میں مصروف رہنے لگے۔ناول میں قصہ کردار اور سماج کے بڑے اور پیچیدہ مسائل کی بحث ہوتی ہے۔اس کے برعکس ناولٹ میں موضوع ،مواد ،اور فضاء موجود ہوتی ہے۔ان چند نتیجہ خیز حقائق کو چند کرداروں کے توسط سے پلاٹ کو سنوارا جا سکتا ہے۔ماحول اور فضاء بنانے کے لئے جزئیات اور تفصیلات کی کسی قدر کم ضرورت ہوتی ہے۔البتہ ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ ناولٹ افسانہ کے پھیلاؤ اور ناول کے اختصار کی درمیانی صورت ہے۔اس میں عمل اور وحدت کا تصور لازمی نہیں بلکہ قصہ کی وحدت اور گہرائی لازمی ہے تاکہ بنیادی باتیں جو کچھ مصنف کہنا چاہتا ہے وہ کہنے میں کامیاب ہو جائے ۔یہی وجہ ہے کہ ناول کہ مقابلے میں ناولٹ کی تخلیق کے لئے تخلیقی اور تعمیری لیاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔یہی خاص بات ہے کہ اس عہد میں ناولٹ کو اہم شہرت ملی ۔اس مقصد کے تحت چند افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں کو طول دینا شروع کیا۔مثلاً ’’ایک چادر میلی سی‘‘ بیدی ’’دل کی دنیا‘‘ عصمت ’’چڑھتا سورج‘‘ یا خالی ہاتھ ابوالفضل صدیقی ’’ایک معمولی لڑکی‘‘ بلونت سنگھ ’’جگنو اور ستارے‘‘ جیلانی بانو ’’بے جڑ کے پودے‘‘ سہیل عظیم آبادی ’’ہاؤسنگ سوسائٹی‘‘ قرۃ العین حیدر ’’بیانات‘‘ جوگندر پال موصوف اپنے تخلیقی سفر کی اس منزل پر ہیں جہاں وہ منزل کو گرد ماننے اور غبار کو منزل بنتے ہوئے دیکھنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں ۔ایک لمبی مسافت اور ایک منفرد تخلیقی وجود جس کی تشریح کرنا یا جس کے بارے میں

کچھ کہنا یا لکھنا آسان بات نہیں رہی۔تجربہ مشاہدہ ،سانحہ،حادثہ ،گرد وپیش کا فاصلہ، مکاں ولا مکاں ،مچلتا ہوا ٹھہراؤ اور متحرک سکون ،خیال اور بے خیالی ،اور ایسا ہی بہت کچھ اپنے کو بیک وقت آشکار کرتا ہے تو جوگندر پال کے ناول کا ہیولیٰ قاری کے آنکھوں کے سامنے ابھرتا ہے۔مرئی اور غیر مرئی وجود اور عدم وجود ہونے یا نہ ہونے
کچھ کہنا یا لکھنا آسان بات نہیں رہی۔تجربہ مشاہدہ ،سانحہ،حادثہ ،گرد وپیش کا فاصلہ، مکاں ولا مکاں ،مچلتا ہوا ٹھہراؤ اور متحرک سکون ،خیال اور بے خیالی ،اور ایسا ہی بہت کچھ اپنے کو بیک وقت آشکار کرتا ہے تو جوگندر پال کے ناول کا ہیولیٰ قاری کے آنکھوں کے سامنے ابھرتا ہے۔مرئی اور غیر مرئی وجود اور عدم وجود ہونے یا نہ ہونے
کی حالت کا تصور کرنا اور اسے صفحہ قرطاس پر ناول کی شکل میں اتارنا ہی جوگندر پال کا کارنامہ ہے۔کبھی اس نے فقیری اور پیری کو زندگی کا منتہائے مقصود مان لیا ہوگا اور یہ بھی جان لیا ہوگا کہ یہ درد ،پستی ،قلندری اور پھکڑ پن کی زندگی کی رمزیت کی آخری حدوں کو چھوڑ کر ہی میسر آتا ہے۔بس یہ کہیں مستعار نہیں ملتا۔اور اس عرفان کو جوگندر پال نے اپنی تخلیق کی اساس بنایا۔جوگندر پال کا ایک ناول ''ایک بوند لہو'' ہے اس کے علاوہ ایک ناولٹ ''بیانات'' اپنے زمانے میں موضوعِ بحث رہا۔اس سلسلے میں حمید سہروردی فرماتے ہیں:

''اس میں پال نے نئے ہندوستان اور نئے ذہن افراد کی تصویر کشی کی ہے۔'' [۱]

[۱]: مضمون اردو ناول پیش رفت ،حمید سہروردی ، بین السطور ،گلبرگہ ۱۹۹۸ء ،ص ۵۸

جوگندر پال بلاشبہ ایک منفرد مزاج اور اور صاف اسلوب ناول نگار ہیں۔اور اردو ناول کے آسمان پر ایک تابناک اور درخشندہ ستارہ بھی ۔ جوگندر پال کو پڑھتے وقت قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ ناول نگار کے ساتھ چلتا ہوا اس کو سنتا ہوا زندگی کی ایمائیت ، رمزیت ، اشاریت کو سمجھتا جا رہا ہے۔ وہ زندگی کی خوب صورتی اور بدصورتی دونوں کو اپنے سامنے عیاں کرتے ہوئے دیکھتا جا رہا ہے۔اور ایک ایسے شعور اور تحت الشعور کے کرشمے کا عرفان بھی حاصل رہا ہے جو اس کے اپنے اندر ہوتے ہوئے بھی اس پر منکشف نہیں تھا۔ جوگندر پال ناول لکھتا ہے ، ناول بنتا ہے ، داستاں بیان کرتا ہے اور ایک ایسی سحر انگیز فضاء پیدا کرتا ہے جس میں صورت حال اور کردار ایک دوسرے میں تحلیل ہوکر ایک رمزیت زدہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں ۔ جوگندر پال کے ناولوں میں زندہ لوگ حیوان میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور حیوان انسان کا شعور او رلہجہ اختیار کر لیتے ہیں ۔اور ناول کی کائنات ایک وجدان کے زیر اثر بڑا انوکھا رقص کرنے لگتی ہے۔محویت جوگندر پال کے ناولوں کی جان ہے اور مسلسل سفر ان کی روح۔

ان کے علاوہ قاضی عبدالستار نے بھی جو چند ناولٹ تحریر کئے ہیں انہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے ناولٹ فنی نقطہ نظر سے ناول سے حد درجہ قریب دلکش اور دلچسپ ہیں۔ان کے کردار اور پلاٹ کی تعمیر اور کرداروں کی پیشکش ڈرامائی ہے۔

اس کے علاوہ حالات حاضرہ میں عام انسان سماجی زندگی میں جس کشمکش کے مراحل سے گذر رہے ہیں اس کی عکاسی اس عہد کے ناول کے بجائے ناولٹ میں زیادہ ہوتی ہے۔قدیم نواب،شرفاء،سرمایہ دارطبقہ کا زوال،صنعتی انقلاب سے پیدا شدہ نتائج یعنی نئی بیداری،عشق ومحبت کے نئے تصور۔جدید وقدیم خاندان یا رواج کا جھگڑا،اونچ نیچ اور بڑے چھوٹوں کے مابین محبت کا فقدان،انسانی جذبات اورفرمابرداروں کی خرید و فروخت اوراس نوعیت کی اوربھی دیگر حقائق کی بے تعصب تصویریں اس عہد کے اردو ناولوں میں نمایاں نظرآتے ہیں ۔یہ بات قابل ستائش ہے مگر دوسری طرف ایسے سنجیدہ اوراہم ناول تخلیق ہوئے ہیں جس میں موجودہ دور کے سماجی مسائل کی کشمکش عیاں نظرآتی ہیں۔مثلاً ''معصومہ'' عصمت چغتائی ''سمن'' رضیہ سجادظہیر ''اپنی اپنی صلیب'' صالحہ عابدحسین اورایوان غزل۔جیلانی بانومحتاج تعارف نہیں۔جیلانی بانو خاتون ناول نگار ہیں۔اس میدان میں ان کی اپنی ایک شناخت ہے جس کی وجہ سے وہ جانی جاتی ہیں۔انہوں نے اپنے ناول میں حیدرآباد کی سرمایہ دارانہ نظام کے زوال کی کہانی تیکھے و تنداحساس اور گہرے سماجی شعور کی روشنی میں قلم بند کیا ہے۔وہ اس نظام میں ہونے والے ظلم وستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں۔ساتھ ہی موصوفہ محنت کش دہقانوں کے باغی ذہن اورانقلابی طاقتوں کی وکالت کرتی ہیں جس کی گرج کڑک،شور ،ہنگامہ،آزادی کے بعدسنائی دیتی ہے۔اوردرمیانہ طبقہ کی عورتوں کے بچپن ، دوشیزگی

،شباب کا دلچسپ افسانہ اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے۔مگران کا کردار ''ایوان غزل'' کی کائنات سے باہر کم دکھائی دیتا ہے اور جو باہر ہو جاتے ہیں وہ قیصر کی طرح لوٹتے نہیں ہیں کہ اپنے انقلابی لڑائی کی داستان سنا سکیں۔ناول میں کرداروں کی زیادتی کی وجہ سے کہانی پیچیدہ بھی ہوگئی ہے۔اس کے بعد موصوفہ اپنے مطالعہ ومشاہدہ کوشش جہتی حکمت عملی ، وسعت نظر ، غیر معمولی فہم وادراک ، تجربہ ، احساس وغیرہ کی بنیاد پر اردو ناول کو چاند اور غزل جیسے دو محبوب اور لازوال کردار خلوص و بے لوث محبت کے ساتھ فراہم کردی ہیں۔

اس طرح اردو ناول کے پس منظر کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر یہ ترقی پسند نظریہ ادب اور زندگی سے قریب ہے۔ ہمیشہ سے یہ روایت چلی آرہی ہے۔ ہر دور میں بدلتی ہوئی زندگی کے رشتوں اور ہمت پر غور وفکر اور اس کی معنویت کی کھوج کا ولولہ اور انسانی جبلت میں پنہاں رہا ہے۔اس وقت پریم چند کا ہی طریقہ مستحکم طور پر رائج رہا ہے۔ جو انسانی زندگی کو خوش گوار بنانے کے ساتھ ترقی کے راستے پر گامزن کرتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک اچھا ناول نگار اپنے حقیقی تجربات کے پیش نظر صداقت پر مبنی ناول نگاری کرتا ہے۔اور تاریخ کی صداقتوں کو سماج میں رہنے والے انسانی رشتوں سے جوڑ کر پیش کرتا ہے۔سماجی زندگی میں جو جو مسائل رونما ہوتے ہیں اس میدان میں داخلی تجربہ ڈرامائی پیش کش اور علامتی اظہار و بیان کے جو تجربے

قرۃالعین حیدر نے کیے ہیں ۔ وہ اظہر من الشّمس ہیں اور ان کی یہی خصوصیات ان کو خاتون ناول نگاروں کا امام بنا دیتی ہے۔ پروفیسر زاہدہ زیدی ان کی ناول ''آگ کا دریا'' کے تعلق سے بجا فرماتی ہیں۔

''اس میں شک نہیں کہ آگ کا دریا نہ صرف قرۃالعین حیدر کا ایک شاہکار ناول ہے بلکہ ایک ایسا ادبی شاہکار ہے جس کی مثال اردو ادب میں مشکل سے ملے گی۔'' [۱]

شہری زندگی اور ناول

غرض کہ قرۃالعین حیدر کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں ترقی پسند ناول ہمارے سماجی ناول پر مبنی ہے یا نہیں اور اس کے ذریعہ اس کا حل ممکن ہے یا نہیں ۔اس کے بارے میں آپ کا ذہن مبذول کرنا چاہو ں گا کہ بیسویں صدی کے چوتھے دہائی کے بعد اردو ناول کا موضوع شہری سماج ہو گیا ہے۔ جب کہ ہندوستان میں اسّی فیصد آتے ہی کلیجہ تھام لینا پڑتا ہے۔ ایسے لوگوں اور ان کو ناول کا موضوع بنانے سے محروم رکھا گیا ہے۔ بہرحال جب ہم اردو ناول کے ارتقاء کے متعلق بات کریں گے تو معلوم ہوگا کہ فی زمانہ اردو ناول کا موضوع اعلیٰ شہری سماج کا حلقہ بن گیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اردو ناول نگاری میں ایسے ناول

۱ : آگ کا دریا، قرۃالعین حیدر، ص ۱۲۷

نگاروں کا فقدان ہے جو دیہات کے سماج سے واسطہ رکھتے ہوں۔ ویسے حالات حاضرہ میں معدودہ چندلوگوں نے دہقانوں اوراس کے احوال، دیہات اور دیہاتی ماحول پرمبنی ناول تخلیق کیے ہیں۔مگران حضرات کے دیہات کے محنت کش طبقے کی زندگی کوایک چشم دہقان سے نہیں بلکہ جاگیردارانہ یا رمیانی طبقہ کی نظر سے دیکھا ہے۔اس لئے ان کی انسان دوستی محنت کش دہقان سے ان کی سچی محبت اوراحساس قرابت کی جگہ ان کی حالت پرکرم یا دردمندی کے جذبات کی چغل خوری یا مخبری کرتی ہے۔ان حضرات کے ناولوں میں غریب اورمحنت کش انسانوں کی مظلومی کی تصویریں تو نظرآتی ہیں مگرظلم وستم کے خلاف ان کی نفرت ان کا جذبہ ان کی روح کا کرب ودردکا سراغ نہیں ملتا۔بیسویں صدی میں بانو قدسیہ، خدیجہ مستور،ممتاز مفتی ،بلونت سنگھ ،ایم اسلم اور ابن سعید ویسے بڑے اور چھوٹے ناول نگاروں کا ایک قافلہ پیہم رواں دواں ہے۔ان ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں تقسیم ہند سے پیدا ہونے والے پیچیدہ سیاسی ، اقتصادی ، سماجی ، آپسی اختلاف ، نفاق ، معاشی بدحالی ، سماجی نابرابری ، بےمروتی ، ناانصافی ، جبر وظلم اور جاگیردارانہ ظلم واستحصال ، جغرافیائی ، ثقافتی وادبی مسائل پرمبنی ناول تخلیق کئے۔تقسیم ہند کے بعد کے بڑے ناول نگاروں نے اس عہد کے حالات کو بڑی فنکاری کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ جہاں وہ لوگ اقدار کے زوال وانہدام کے نوحہ گری کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔جتندر بلّو ، ہرچرن چاولہ ، انور خان وغیرہ نے انسانی

تضادات ، لوگ دیہات میں بستے ہیں۔وہ مزدور کسان ،محنت کش اور معصوم ہیں۔ان لوگوں کو بڑے بڑے مسائل ، حادثات و واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔وہ ایسے مراحل سے گذرتے ہیں جس کا ذکر شدید ردعمل ہجرتوں کا سلسلہ اور ان سے متعلق معاملات وحالات اور مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔اسی عہد میں بلونت سنگھ کے ناول شہری عامیانہ پن کے زد کا شکار رہی ہیں۔جمیلہ ہاشمی ، مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں دیہات اور شہر کی دوئی اور باہمی ترسیل کا بحران ہے۔سید محمد اشرف کے ناول میں ثقافتی اداروں کے زوال وانتشار اور انسانی غم والم افسردگی اور حرماں نصیبی رقص کرتی ہیں۔جیلانی بانو کے ناولوں میں متعدد قسم کے مرد وعورت کردار ملتے ہیں۔اور دبی زبان میں جنسی معاملات اور عاشقانہ واردات کی تفصیل وتشریح دکھائی دیتے ہیں۔ساجدہ زیدی کھلے انداز میں غیر روایتی جنسی رشتوں کی پیش کش کرتی ہیں۔ریوتی سرن شرما کے ناول کی عورت جہاں رشتہء ازدواج کی حدود کے اندر رہنے کے باوجود اپنی انفرادی شناخت کا حق مانگتی ہے۔اس کے علاوہ بیسویں صدی کو الوداع کہ کر اکیسویں صدی کو خیر مقدم کرنے والے ناول نگاروں میں نئے اور پرانے چراغوں کا متحرک اور فعال قافلہ ہے جو پیہم ہر گام اپنے منزل مقصود کی جانب رواں دواں ہے جس میں مظہر الزماں ،کوثر مظہری ،فہمیدہ ریاض ،اقبال مجید ،انور سجاد ،عمراؤ طارق ،احمد داؤد ،آغا سہیل ،فخر زمان ، طارق محمود ، خالد سہیل ،شام بارک پوری ،محسن علی ، یعقوب

یاور، پروفیسر،محمد حسن، الیاس احمد گدی، غضنفر، گیان سنگھ شاطر، احمد صغیر، وبھوتی نرائن ،شام سندر آنند وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

الیاس احمد گدی نے صوبہ بہار کے شہر ''جھریا'' کے ایک چھوٹے سے علاقے کو اپنی نگاہ میں رکھا ہے۔ ناول میں'' فائر ایریا'' کو بلیغ اشاریہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔اس میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ صنعتی نظام نے استحصال کی جو شکلیں اختیار کی ہیں اس کی روداد پیش کی گئی ہے۔ یہ کہاں جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جس طرح الیاس احمد گدی کا ناول ہم عصر صنعتی ترقی کے در پردہ اس مکروہ استحصالی نظام کا مرقع ہے جو طبقاتی معاشرے کا لازمی وصف ہے۔اور جو اس بات کی بھی غمازی کرتا ہے کہ جاگیردارانہ عہد اور انگریزوں کی غلامی سے نجات کا دعویٰ اور صنعتی ترقی کی چمک دمک اس طبقے کے لئے بے سود و بے معنی ہیں۔'' فائر ایریا'' کا موضوع ایک مسلسل نا انصافی اور ایک مسلسل استحصال ہے جسے مصنف نے بچپن سے جوانی تک اپنے آس پاس مسلسل دیکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ کول فیلڈ کی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے،استحصال کا کرب مزدوروں کے ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن وہ گھٹ گھٹ کر زندگی کا زہر پینے پر مجبور ہوتے ہیں۔حق کی آواز بلند ہوتی ہے لیکن وہ اتنی بے رحمی سے دبا دی جاتی ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بھوک، مجبوری، لاچاری، بے بسی،غریبی، اور ظلم کا ننگا ناچ روزمرہ کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔الیاس احمد گدی نے اپنے ناول میں اس ماحول کی تصویر پیش کرتے

ہوئے جس عمیق تجربے اور مشاہدے کو بروئے کار لاتے ہیں اس کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس ناول کو لکھنے کا حق صرف اور صرف انہیں ہی حاصل تھا۔ ''فائر ایریا'' کا محور جس صنعتی وسرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ہے۔ وہاں کے مزدور سیکٹر کے ٹریڈ یونین کی سیاست کی مختلف شکلیں ،اس کے مختلف رخ جس مہارت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں وہ قابل تعریف ہے۔ الیاس احمد گدی نے ناول کے فن کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تھا، وہ اس فن کی بوطیقا کو بہت اچھی طرح سے سمجھ چکے تھے۔ اس خوبی سے کہ فائر ایریا لکھتے ہوئے وہ اس فن کے کسی حصے پر اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کرتے۔ پلاٹ سے کردار نگاری تک اور نظریاتی شعور سے اسلوب بیان تک ہر مرحلہ انہوں نے بے حد فنکاری کے ساتھ طے کیا ہے۔ اور فنی جمالیات کی قدروں سے کہیں بھی روگردانی نہیں کی ہے۔ ایک سچے فنکار کی طرح ان کا خمیر ان کے ارد گرد کی حقیقتوں سے تشکیل پاتا تھا۔ اس لئے ان کے یہاں حقیقت پسندی نظر آتی ہیں۔ اور ان کے الفاظ طبقاتی احساس وشعور سے لبریز ہونے کے باوجود پڑھنے والے پر معروضی تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ ''فائر ایریا'' کے بعض واقعات مثلاً مجمدار کے قتل کی پلاننگ اور مجمدار کی موت کے بعد ایک جاہل اور گنوار عورت کا جلوس کے ساتھ ساتھ قاتلوں کو پھانسی دینے کا نعرہ لگانے وغیرہ کو بعض حضرات فلمی انداز کا عیب قرار دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ محترم وہاب اشرفی جیسے ناقد نے بھی اسے میلو ڈرامائی کیفیت سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ واقعی فائر ایریا کے کچھ واقعات

خاص کر قتل وخون اور جلسہ جلوس کے مناظر انتہائی میلوڈرامائی اور ایک دم فلمی انداز لئے ہوئے ہیں ۔لیکن اسے تخیل کی دین سمجھ کر فلمی اور غیر اصلی سمجھ لینا صحیح نہیں کیوں کہ کول فیلڈ میں رہنے والے جانتے ہیں کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں ایسے واقعات دن رات پیش آتے رہتے ہیں ۔عورتوں کا جھنڈا لے کر جلوس میں شامل ہونا ایک عام بات ہے۔ جبر اور استحصال سے قطع نظر بالکل آمنے سامنے صف آراء ہونے کی کیفیت وہاں موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ ہماری زندگی پر آج میڈیا کا بے پناہ اثر بالکل واضح ہو گیا ہے۔ اس لئے تخلیقی ادب کو میلوڈرامائی کیفیتوں سے نزدیک رکھنے کو عیب کے بجائے خوبی میں شمار کرنا چاہئے ۔ایسے گنے چنے لوگوں میں الیاس صاحب کو آسانی سے رکھا جا سکتا ہے۔ ایسا اس لئے بھی کہ الیاس صاحب کہانی کہنے کہ فن سے واقف ہیں اور انہیں ماجرا سازی کا ہنر آتا ہے۔ کچھ برس پہلے ہندی کے مشہور کتھا کار سنجیو کا ایک ناول شائع ہوا تھا ۔ساودھان! نیچے آگ ہے۔ یہ ناول فائر ایریا یعنی کول فیلڈ میں کام کرنے والے ان مزدوروں کی زندگی پر مبنی تھا جو اندر دہک رہی آگ کی بھٹی میں اپنے حال اور مستقبل کو فراموش کر بیٹھے ہیں ۔تب خیال آیا تھا کہ یہ ناول غیاث صاحب نے کیوں نہیں لکھا؟ یا اس موضوع پر الیاس صاحب نے قلم کیوں نہیں اٹھایا جب کہ ان کا تعلق اسی فائر ایریا سے ہے۔ جہاں اکثر مزدوروں کی زندگی کا سودا ہوتا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے میں الیاس احمد گدی کو مبارک باد پیش کرتا ہو کہ اس بہانے انہوں نے کولیری کی اس دنیا میں جھانکنے کی

کوشش کی ہے، جہاں گھٹن ہے، گھپ اندھیرا ہے، کھولتے ہوئے گرم لاوے ہیں، اندر آگ ہے اور اس آگ میں گندم کی طرح پتا ہوا مزدور ہے۔ الیاس نے اس ناول میں کہیں شاعری نہیں کی ہے۔ ماحول ویسا ہی پیش کیا ہے جیسا کولیری کا ہونا چاہیئے کرداروں کے مکالمے ویسے ہی رہنے دیے ہیں جیسا کہ وہ بولتے ہیں۔ علاقائی زبان کے علاوہ بہار کی دوسری بول ٹھولی پر بھی الیاس کی گرفت مضبوط ہے۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فائر ایریا کی تخلیق وہ شخص کر رہا ہے جو بہار کے جغرافیائی حدود، زبان، ماحول اور کلچر سے بخوبی واقف ہے۔ اس واقفیت نے فائر ایریا کو ایک عمدہ اور کامیات ناول بنا دیا ہے یہ مکمل طور پر ریسرچ کا موضوع تھا ایسے ناول کی تخلیق ہوا میں ممکن نہیں تھی۔

بچوں کی ناول

اُردو میں آج بچوں کا ادب لکھنے والا کوئی نہیں۔ یہ انتہائی افسوس کی بات ہے۔ بڑے ادیب بچوں کے لیے لکھنا کسر شان سمجھتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا انتہائی ذمہ داری کا اور مشکل کام ہے۔ کہانی انکل کی کہانی بچوں کے گرد گھومتی ہے ایک کہانی انکل ہیں جو کہانیاں سناتے ہیں اور ڈھیر سارے بچے ہیں جو کہانی انکل کو ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔ غضنفر کا اپنا ایک منفرد اسلوب۔ اور یہ نیا ڈکشن یا اسلوب اب

ناول میں بھی نظر آتا ہے۔یعنی ایسا انوکھا ڈکشن ،جس سے بچے اور بڑے دونوں ہی لطف اندوز ہوسکیں اور کہنا چاہیے غضنفر اپنے اس ڈکشن کی دریافت میں کامیاب ہیں۔ہاں ایک بات ضرور ہے کہ کہانی بالکل ناول نہیں ، ناول بنایا گیا ہے۔اوراس کے لیے بس تھوڑی سی مغزماری کی گئی ہے۔یعنی کہانی والے انکل اور بچوں کا سہارا لیا گیا ہے۔اس کی زیادہ تر کہانیاں پہلے ہی رسائل وجرائد میں چھپ چکی ہیں ہاں حیرت والی کہانی کا ایک حصہ وکٹر ہیوگو کے مشہور ناول لیس مزاریبل کی یاد دلاتا ہے خاص کر یہ حصہ۔اندھا دیکھ رہا تھا، آنکھ والاٹھوکر کھا کرر ہا تھالنگڑا دوڑ رہا تھا۔اس ناول کا پادری جب اندھوں کی نگری میں پہنچا ہےتو اس کے ساتھ کم وبیش یہی واقعہ آتا ہے۔

ادب ، ادب ہوتا ہے۔ادب میں کشف وکرامت اورمعجزے جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔مگر جب کبھی گیان سنگھ شاطر جیسی حیرت زدہ کردینے والی کوئی کتاب سامنے آتی ہےتو اس اکیسویں صدی میں بھی معجزے کا قائل ہونا پڑتا ہے۔یہ ایک سوانح ناول ہےاوراسے قلم بند کرنے والافن کاروہ ہے جس نے اپنی شخصیت کی پرتیں کھولنے کے لئے اس زبان کا انتخاب کیا،جس زبان سے وہ خود بھی انجان تھا لیکن وہ محسوس کرتا تھا کہ جذبات واحساسات کے اظہار کے لئے اردو سے بہتر کوئی دوسرا وسیلہ نہیں۔حقیقت شناسی کی جس سڑاندھ سے وہ اپنی ذات کے موتی لٹانا چاہتا تھا اس کیلئے صحیح معنوں میں اردوزبان کی لچک کی ضرورت تھی۔اس زبان کی رعنائی ، دلکشی ، شیرینی ، روانی ، لطافت

اس آپ بیتی کو بھر پور صحت اور زندگی بخش سکتا تھا۔ گیان سنگھ شاطر ایک تو سب سے بڑی خوبی مجھے یہ نظر آتی ہے، آنکھیں کھولتے ہی یہ اپنی ذات کے تعاقب میں نکل پڑا۔ اور ایسا لکھا کہ آپ کبھی بھی واقعہ کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔ ایک فن پارہ کی اس سے زیادہ کامیابی اور کیا ہوگی؟ یہ کتاب صرف آپ بیتی تک محدود نہیں ہے شاطر نے اس میں ایک پورا جہان آباد کر رکھا ہے جانا پہچانا بھی اور ان دیکھا سا بھی ۔ایک ماں ہے، شفقتوں والی ، بیٹے پر اپنی دعاؤں کا سایہ کرنے والی ماں، اپنے شوہر کے سائے سے ڈر جانے والی ماں۔ اندر ہی اندر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے والی ماں۔ روایتی زنجیروں میں جکڑی ڈری ڈری سی خوفزدہ سی ماں، ایک تایا بھی ہے جو عورت کی عظمت کے قائل ہیں انتہائی فیاض، بردبار، ایک ایسا انسان جو کسی کا بھی آئیڈیل ہوسکتا ہے۔ اور ایک بھائیا جی جو انسانوں سے حیوانوں جیسا اور حیوانوں سے درندوں جیسا سلوک کرتے تھے۔ تایا جہاں عورت کو تخلیق کا سرچشمہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ عورت ہی سرشٹی ہے، وہیں بھائیا جی کی رائے بالکل مختلف ہے وہ کہتے تھے۔عورت اور کتیا کی نفسیات ایک سی ہے۔ اسے روٹی کپڑا نہ دو اس چڑے سے لپٹے رہو اور تھن چوستے رہو۔ یہی اس کی زندگی ہے اور یہی آسودگی ۔ یہ دو غیر معمولی کردار ایسے ہیں، جو اردو ادب کی تاریخ میں اضافہ تو ہیں ہی شاطر کا مقام متعین کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ عجیب وغریب کردار تایا جی جہاں ایک آئیڈیل کے طور پر دل و دماغ کے گوشہ میں اپنی جگہ محفوظ کرتے ہیں، وہیں

بھا ئیا جی کی عورتوں کے بارے میں سوچ ، بھا ئیا جی کی گفتگو، ان کا لب ولہجہ۔۔۔اگر منٹو کے بارے میں کہا جائے کہ اس نے صرف ٹوبہ ٹیک سنگھ دیا تو تب بھی اردو ادب ان کا احسان مند ہوتا۔۔۔یہی بات ان کرداروں کے حوالے سے کہی جا سکتی ہے ایسے نا قابل فراموش کردار سے گیان سنگھ شاطر اردو زبان کا دامن وسیع کر گئے ہیں۔ایک طرف جہاں یہ انوکھے کردار ہیں اور شاطر کا بچپن ہے اس کا نسائی حسن ہے، اس کی جوانی ہے، جوانی کی ترنگیں ہیں، سرمستیاں ہیں اور مجبوریاں ہیں، وہیں سرزمین پنجاب میں اگی ہوئی وہ حیرانیاں ہیں جنہیں دیکھنے کی تاب رکھنے والی آنکھیں ہونی چاہیے اور جسے اپنی مخصوص انداز بیان میں شاطر نے انوکھا پنجاب بنا دیا ہے۔ بیدی نے اپنے کہانیوں میں جس پنجاب کا چھلکا بھرا تھا، بلونت سنگھ نے جس کی گودے میں پنجابی مردوں کی آن، بان اور شان، دیکھنے کی جرأت کی تھی، شاطر نے اس پورے پنجاب کو تہہ در تہہ اس طرح کھول دیا ہے کہ آنکھیں ششدر رہ جاتی ہیں۔

وبھوتی نارائن رائے کا نام اردو حلقے میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اگر چہ وہ پولیس کے اعلی افسر ہیں۔لیکن بطور ہندی ادیب ان کی شناخت بڑی مستحکم اور معتبر ہے''شہر میں کرفیوں'' اس کی تازہ ترین پیشکش ہے۔اس سے وبھوتی نرائن رائے کی ایک نہایت اہم تحقیقی کتاب ''فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستانی پولیس'' منظر عام پر آچکی ہے، جسے اردو حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔''شہر میں کرفیو'' کی

اشاعت سب سے پہلے ۱۹۸۷ء میں ہندی زبان میں ہوئی تھی۔اس کے بعد ہندوستان کی اہم زبانوں میں اس کے تراجم شائع ہوئے۔ انگریزی میں بھی اس کا ایڈیشن منظر عام پر آیا۔اردو میں کئی اخبارات ورسائل نے اس ناول کے بعض حصے قسطوں میں شائع کئے لیکن اب اردو میں اس کی اشاعت بھی ہوگئی ہے۔انہوں نے خودنوشت کے طور پر جن حقائق سے پردہ اٹھایا ہے،انھیں پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف بنیادی طور پر ایک انسان دوست شخصیت ہیں اسی لیے انھوں نے خود فرقہ وارانہ فسادات کے دوران اپنے محکمے کے تعصّبات، پیشہ ورانہ خامیوں،اور جبر کو اجاگر کرنے میں کسی پس وپیش سے کام نہیں لیا۔وبھوتی نارائن رائے نے اس ناول کی تخلیق کا پس منظر یوں بیان کیا ہے۔

شہر میں کرفیو ایک مختصر ناول ہے مگر اس کو ضبط تحریر میں لاتے وقت مجھے بڑی پریشانیوں سے گزرنا پڑا۔اس کے بہت سے کردار اور واقعات الہ آباد شہر کے ایک چھوٹے سے مضافاتی محلے سے تعلق رکھتے ہیں۔۱۹۸۰ء کے فسادات کے دوران میں ان لوگوں اوران کے محلے سے وقف ہوا تھا ان کا دکھ اتنا شدید تھا کہ اس کو لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی مجھے بار بار یہ محسوس ہوا کہ اس کے اظہار کے لیے مناسب الفاظ میرے ذہن سے پھسلتے جارہے ہیں۔ میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا تھا۔اس کو لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ زبان افکار کا ناقص متبادل ہے۔اگر یہ کتاب ایک بھی قاری کو سعیدہ اور دیوی لال کا دکھ محسوس

کرنے کا اہل بنتی ہے۔ یا کسی ایسی انیا کا خواب دیکھنے کی تحریک دیتی ہے جس میں کوئی فساد برپا نہ ہوتا ہو یا اس کے ذریعہ فساد برپا کرنے والے عناصر کے لیے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے تو سمجھوں گا کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔

اس شہرہ آفاق ناول میں سماج کے ایک ایسے طبقے کے درد اور کرب کو زبان دی گئی ہے، جسے تعصب اور تنگ نظری سے ہمیشہ دبائے رکھا۔ یہ ناول کرفیو کے دوران سماج کے کمزور اور بے بس لوگوں کی لاچاری اور مجبوری کا ایسا دلدوز منظر پیش کرتا ہے، جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس ناول میں فساد بھڑکانے اور اس کا سیاسی استحصال کرنے والے عناصر کو پوری جرات اور بے باکی کے ساتھ بے نقاب کیا گیا ہے۔ فساد کے دوران امن قائم کرنے کے نام پر پولیس فورس، مظلومین کے ساتھ جبر و استبداد اور تعصب کا جو سلوک روا رکھتی ہے۔ اسے خود اسی محکمے کے ایک اعلیٰ افسر نے فکشن کی زبان میں بڑی چابک دستی اور روانی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس لیے ناول کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے۔ وبھوتی نارائن رائے نے ہندوستانی پولیس کی کارگردگی اور ہندو مسلم فسادات میں پولیس کے رول سے اپنے عملی اور براہ راست واقفیت کے باعث اس ناول کو ایک واضح دستاویزی بنیاد بھی عطا کی ہے۔ ان کا مشاہدہ بہت دوٹوک، کھرا اور پھیلا ہوا ہے۔ ہندو مسلم فسادات جیسے آتش فشاں اور پیچیدہ موضوع پر ''شہر میں کرفیو'' کی قسم کا ناول لکھنا آسان نہیں ہے۔ وبھوتی نارائن رائے نے اس ناول میں فکشن نگار

کے ساتھ ساتھ ایک مشاہدہ ایک سماجی مبصر کے رول بھی ادا کے ہیں اور اپنے ہر رول میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ان کی اس تخلیق کا خطاب صرف ادب کے قاری نہیں ہیں انھوں نے ہمارے زمانے کی معاشرت، سیاست اور سماجی اجتماعی زندگی کی قیادت کرنے والے ان تمام لوگوں سے مکالمہ کیا ہے جن کے ہونے سے یہ زندگی داغدار دکھائی دیتی ہے، چنانچہ یہ چھوٹی سی کہانی ایک آئینہ بھی ہے۔جس کی اپنی سطح تو بہت شفاف ہے، لیکن اس سطح سے جھانکتے ہوئے عکس کو یکھ کر دل ڈوبنے لگتا ہے۔

علاقائی کشمکش اور ناول

شام سندر آنند (قلمی نام آنند لہر) ان کی اب تک ''انحراف'' اور تین ناول ''سرحد کے اس پار'' سرحدوں کے بیچ'' اور ''مجھ سے کہا ہوتا'' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔زیر تبصرہ ان کا چوتھا ناول ہے اس کی تخلیقی فضا سر زمین کشمیر پر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۶ء تک رونما ہونے والی درد بھری داستان سے تیار کی گئی ہے۔آنند لہر کے دوسرے ناولوں سے بھی کشمیر کے متعلق ان کے دردمند دل کی غمازی ہوتی ہے۔ اس ناول میں قبائلیوں اور پٹھانوں کے ذریعے وادی کشمیر کی مجروح ہوتی ہوئی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہاں پوجا اور نماز دونوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے اور

ہندو مسلم دونوں ایک دوسرے کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اس ناول کا سب سے اہم واقعہ مندر سے شنکھ کا چوری ہو جانا ہے۔ جس سے مندر کا پجاری بدری غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے اور بالآخر وہ ایک ٹریننگ کیمپ میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کا دوسرا اہم حصہ وہ ہے جہاں سلیمان کو فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کی پاداش میں قتل کر دیا جاتا ہے۔ نیز ظلم کے خلاف احتجاج کرنے والی اس کی بیوی ساجدہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اس کے بعد اس کی بیٹی نجمی کی عزت بھی محفوظ نہیں رہتی۔ اس ناول کی فنی اعتبار سے پرکھنے کی بجائے ناول نگار کے اس ذہنی رویے کو دیکھنے کی ضرورت ہے جس کی بنا پر یہ ناول وجود میں آیا فنکار نے اس ناول کے ذریعہ یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ فکر و عمل سے اس دنیا کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ اس جذبہ یقیناً قابل قدر ہے۔ چنانچہ موضوع اعتبار سے یہ ناول اپنے اندر بڑی کشش رکھتا ہے۔

آج کل جدید ذہن کے کئی ناول نگاروں نے اپنی اپنی دلچسپی کے تحت منتخب موضوعات پر ناول نویسی کر کے اردو ناول کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی سعی کی ہے جن میں عبدالصمد، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی، پیغام آفاقی، علی امام نقوی، کشمیری لال ذاکر، شموئل احمد، شبّر امام، تنویر جہاں، اور محمد علیم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ علی امام نقوی بہت اچھی نثر لکھتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کچھ ناولوں کو پڑھ کر یہ تاثر فوری طور پر نہیں ابھرتا۔ کیونکہ ان کی اکثر ناولوں میں مقامی بولی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔

ناول کے نثر کی ایک خوبی یہ بھی ہے۔ کہ اسکے مکالموں میں مقامی رنگ بے روک ٹوک آ سکے۔ وہ بمبئی کے باہر کے عام متوسط طبقے اور نچلے طبقے کی زندگی اور معاشرت کی بھی بڑی عمدہ عکاسی کرتے ہیں رسم و رواج اور مختلف طبقوں کی اصطلاحات کا حال پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں زندگی اور زندگی کے مظاہر سے کتنی دلچسپی ہے۔ عبدالصمد اردو ناول میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ ان کے متعلق پروفیسر صغیر افراہیم یہ رقمطراز ہیں۔

''عبدالصمد نے اپنے ناولوں میں زندگی کے حقائق کی غیر مشروط جستجو اور شناخت پر توجہ مرکوز کی ہے انہوں نے نئی نسل کی ذاتی سوچ اور نجی مجبوری کو سیاسی اور سماجی نظام سے ہم آہنگ کر کے اسے ایک تخلیقی جہت عطا کی اور عصر حاضر میں زندگی کے تیزی سے بدلتے ہوئے نظام کو سمجھنے اور اس کو فنی شعور کے ساتھ قاری تک پہنچانے کا اہتمام کیا ہے''۔[1]

عبدالصمد کا ناول مہاتما منظر عام پر آیا تو اس اعتبار سے ناول اور ناول نگار ضرور چونکا دیا ان کی تحریروں میں صرف مواد بلکہ پیش کش کی سطح پر بھی شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ ناول میں نہ عشق کی پھیلی ہوئی داستان ہے اور نہ ہی تاریخی ناولوں جیسی چمکتی ہوئی تلواریں ہر صفحے سے نمودار ہوتی ہیں بلکہ یہاں آج کی زندگی کے ایسے احول کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس میں چاہے متوسط طبقہ ہو، اعلی طبقہ ہو یا کسی اور طبقے کے

[1]: مضمون عبدالصمد کے ناول عہد حاضر کا تخلیقی رزمیہ، اردو کا افسانوی ادب، پروفیسر افراہیم، علی گڑھ ۲۰۱۰ء، ص ۲۲۱

انسانی نسل کی بیداری کی داستان ہو۔اس عہد کواس نظام سے گزرنا ہی ہوگا جواس ناول میں بہت فطری انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یعنی آج کے موجودہ تعلیمی نظام کی گرتی ہوئی صورت حال کے لئے انہوں نے جن کرداروں کوسوالوں کے حصار میں قید کیا ہےان میں سیاست داں۔والدین۔طلباء۔اساتذہ۔قابل ذکر ہیں۔اس میں ایک کردار ہے جوفرسٹ کلاس میں ایم اے کرنے کے بعد پروفیسر پرساد سے اپنے مستقبل کے بارے میں باتیں کرتا ہے دوراستے اس کے پیش نظر ہیں۔ایک سول سروس میں جانا اور دوسرا کالج کا ٹیچر ہونا۔شاید راکیش کے ذہن میں کہیں یہ بات ہی تھی کہ سول سروس میں وہ زیادہ کامیاب ہوسکتا ہے۔اس لئے پروفیسر کے سامنے وہ اپنی بات یوں رکھتا ہے کہ پروفیسر پرساد کاتعلق جس نسل سے ہے اور راکیش جس نئ پود سےتعلق رکھتا ہے دونوں کی فکری جدوجہد میں بہت تبدیلیاں ہوچکی ہیں۔ناول نگار جس سسٹم کی بات راکیش کے حوالے سے کرنا چاہتا ہے ناول کا مرکزی خیال بھی وہی ہے۔ایسے میں جب یہ حادثہ رونما ہوجاتا ہے کہ لیکچرر کے عہدے کے لئے شعبہ سیاسیات میں سب سے اچھی درخواست ہونے کے بادجود راکیش کواس عہدے کے لیےنہیں چنا جاتا ہے۔عبدالصمد نے اسی موقع پرایک اسی نسل کے آئیڈیل کردار پروفیسر پرسادکوموت سے ہم کنار کیا۔ پروفیسر بھی اس کے لیےصحیح معنوں میں ایک موہوم سی امید تھے۔جب راکیش کی فیلوشپ بھی ختم ہوئی تو آمدنی کا یہ ذریعہ بھی ختم ہوا۔اب کردار میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔

ناول نگار نے بہت فطری انداز میں اس کے جدوجہد کو ٹھیک اسی اندز میں بیان کیا ہے جس سے موجودہ عہد کے ایسے اشخاص روز گزرتے ہیں۔ کردار کو پینٹ کرتے وقت عبدالصمد نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ وہ بتدریج فطری طور پر بدلے یہاں کچھ بھی تھوپنے یا خواہ مخواہ کی آئیڈیالوجی کی بات نہیں کی گئی ہے ناول میں وہ مقام بھی آتا ہے جب راکیش کر یہ احساس ہونے لگا کہ وہ اسی سمندر کی مچھلی ہے۔ جہاں سے اسے نکال کر پھینکا گیا تھا۔ ایک طرف پروفیسر پرساد کا آئیڈیل کردار مر چکا تھا تو دوسری طرف ڈاکٹر سنہا جیسے لوگ بھی تھے۔ اگر کوئی ایسا کردار ابھر کر سامنے نہ آئے تو شاید سوچ اور بھی بے ترتیب ہوکر کوئی تخریبی رخ اختیار کر لے۔ راکیش کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا، وہ اپنی صلاحیتوں کے باوجود اپنی ڈگری کے بل بوتے پر صحیح مقام حاصل نہیں کر سکا۔ ڈاکٹر سنہا نے راکیش کی صلاحتوں اور اس کی ناکامیوں کو مقصد دیا۔ جینے کا مقصد۔ لیکن یہاں سے کردار زوال کی منزل کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ جہاں سے اس کا کسی طرح لوٹنا مشکل تھا۔ عبدالصمد نے ناول کے اس موڑ پر آکر لاشعوری طور پر ایک ایسا اعلان بھی کر دیا ہے جس کا اندازہ قاری کو اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے شعور کی رو میں بہتے ہوئے اچانک راکیش کے آئیڈل کردار کو پیچھے چھوڑ کر ایک نئے راکیش کے ساتھ بہت آگے نکل چکا ہوتا ہے۔ ناول کئی اعتبار سے دعوت فکر دیتا ہے اور بہت بے باک رویئے کے ساتھ قاری کے سامنے آتا ہے۔

بکھرتی ہوئی قدریں اور ناول

ذاکر صاحب، ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں مشہور ہیں۔
کشمیری لال ذاکر کا ناول ''اگنی پریکشا'' ہماری ان بکھرتی ہوئی تہذیبی اقدار کی نشان وہی کرتا ہے جہاں مشترکہ خاندان اب سمٹ کر نیوکلیر کنبوں میں تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔ اوراب ان کنبوں میں خاندان کے بوڑھے افراد کے لیے جنھیں آج کی اصلاح میں ہم سینئرسٹیزن کہتے ہیں، کوئی گنجائش نہیں سوائے اس کے کہ وہ مغربی ممالک کی طرح اولڈ ہوم آباد کریں۔ ہمارے ہندوستان کی سات آٹھ سو سال کی مشترکہ تہذیب کے نمائندہ ہیں ان کا شمار اردو کے ممتاز فکشن رائٹر میں ہوتا ہے۔ ان کا نیا ناول ''اگنی پریکشا'' عمر رسیدہ لوگوں کے مسائل کو بہت اچھی طرح سمجھا اور بڑی خوبی سے اپنے ناول میں پیش کیا ہے۔ ہزاروں سال سے ہندوستان میں مشترکہ خاندان کی روایات ہیں۔ اس طرح کے خاندان میں خوبیاں بہت زیادہ ہیں اور خرابیاں بہت کم۔ ایسے خاندانوں میں بزرگوں کو تنہائی کے کرب سے گزرنا نہیں پڑتا ہے۔ پھر ان کے صلاح ومشورے خاندان کے نوجوانوں اور بچوں کے لیے بہت بڑی نعمت ثابت ہوتے ہیں۔ کچھ عرصے سے ہندوستان میں نیوکلیر فیملی پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ جب لڑکوں کی شادی ہو جاتی ہے تو وہ اپنی بیوی کو لے کر الگ گھر میں چلے جاتے ہیں۔ اس طرح کے خاندان میں

خوبیاں کم ہیں اور خرابیاں بہت زیادہ۔ جب اولاد ماں باپ کو تنہا چھوڑ کر الگ گھروں میں چلے جاتے ہیں تو ماں باپ کے ذہنی کرب کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے بھٹکنے کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔ کشمیری لال ذاکر صاحب نے ان تمام مسائل کی طرف بڑی خوبی سے توجہ دلائی ہے۔ میں مشترکہ خاندان کے سلسلے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں مشترکہ خاندان کے ساتھ ساتھ سماج، روایات اور کلچر کی بہت زیادہ اہمیت رہی ہے۔ آج وہ قدریں شکست و ریخت کی زد میں ہیں۔ اس وقت مغربی دنیا کا سب بڑا بحران یہ ہے کہ وہاں انسانی رشتے ٹوٹ رہے ہیں۔ نوجوان اپنے والدین کا بالکل خیال نہیں کرتے جب ماں باپ ریٹائر ہو جاتے ہیں انھیں اولڈ ایج ہوم میں بھیج دیتے ہیں اور سال میں ایک دو فعہ ان سے ملاقات کے لیے آتے ہیں۔ شبر امام نے کئی برس قبل اپنے سماجی اصلاح کے نقطہ نگاہ سے تاریخی اور اصلاحی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا۔ حب الوطنی کسانوں اور مزدوروں کا استحصال، غریبی امیری کی آویزش، راست بازی، اولوالعزمی، بلند اخلاقی اور انسانیت نوازی موصوف کے ناولوں کے موضوعات ہیں، ان کے ناولوں میں مشترکہ کلچر، ہندو مسلم اتحاد اور قومی یک جہتی کی کامیاب، جھلکیاں ملتی ہے۔ مشہور ناول نگار بیمنگ دے کا قول ہے کہ اصل تخلیق کار زندہ اور دیکھے بھالے افراد کو ہی اپنے ناول کے کردار کے طور پر چنتا ہے بیمنگ دے کو خیالی کردار کے وجود سے انحراف ہے۔ شبر امام کے ناولوں کے

کردار بھی اکثر ایسے ہی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو ہمارے شناسا ہیں وہ کہیں سے ایک قصہ شروع کر دیتے ہیں اور اپنی حکمت عملی سے فنکارانہ رنگ میں پرو دیتے ہیں۔ موصوف کا تعلق دیہی ماحول سے ہے اور وہ ''فائر ایریا'' کے مصنف الیاس احمد گدی کی طرح دہقانوں کی حالت زار کو بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں شبر امام کا ایک ناول ''شاہین'' ۱۹۹۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ''جب گاؤں جاگے'' ان کا دوسرا شاہکار ناول ہے۔ مجموعی طور پر یہ ناول دیہی زندگی کے پیچ وخم، شکست و فتح، تخریب وتعمیر، تضاد وتصادم، آویزش و آمیزش، انقلابات و حادثات، ظلم و جور، آہ وفغاں، کساد بازاری، دہشت گردی، جاگیرداری، رسم ورواج سے منور ومعمور ہے۔ ساتھ ہی ناول میں مصنف نے دیہاتوں کی نئی بیداری، اصلاح اور حقیقی ترقی کے لیے توازن کے ساتھ جستجو کرنے کی بات کہی ہے۔ تاکہ یہ ملک ہر عہد میں ہر محاذ پر ترقی وتعمیر، امن وامان کی تاویل وتشریح کے لیے عالم گیر پیمانے پر خود کو پیش کر سکے اور باعث فخر بن سکے۔ مصنف نے جس عظیم مقصد کے تحت یہ ناول لکھا ہے۔ اس مقصد میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔ اس ناول کے ذریعہ انہوں نے تقسیم وطن اور اس کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والی المناک صورت حال کو قلم بند کر کے اردو فکشن کے خزانے میں قابل تحسین اضافہ کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک دلچسپ سیکولر اقدار پر مبنی معاشرتی ناول ہے۔ شموئل احمد بھی کئی ناول کے مصنف ہیں۔ ناول نگاری کی دنیا میں موصوف لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کا ناول ''مہاماری''

کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریاست بہار میں ہو رہی سیاسی بدعنوانی سیاسی معاشی مفاد پرستی اور دفتری امور کے چولی دامن کا رشتہ، چور بازاروں میں نوکرشاہوں اور سیاسی آقاؤں کی برابر کی شرکت اور گورکھ دھندوں کے اجتجاج میں شموئل کا تخلیقی ذہن رقص کناں ہے کہانی کی ترتیب و تنظیم صوبہ بہار کے سیاسی منظر نامے کے پس منظر میں کی گئی ہے۔ اس لیے بیان کردہ تمام واقعات و معاملات کا اطلاق بہ ظاہر تو صوبہ بہار کی سیاسی سرگرمیوں پر ہوتا نظر آتا ہے۔ لیکن جس قسم کی سیاسی داؤ پیچ کی رنگ آمیزی اس ناول کے کینوس پر کی گئی ہے اس سے پورے ملک کا سیاسی نقشہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ تخلیقی طریقہ کار شموئل احمد کے عمومیت پسندانہ ذہنی رجحان کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ناول کے ابتدائی مکالموں سے ناول نگار کے فکری موقف کی وضاحت تو ہوتی ہی ہے ساتھ ہی ساتھ سیاست کے مفاد پرستانہ رویئے اور انحطاط پذیر سماجی قدروں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ زندگی اور سماج کے ہر ان زخموں پر نشتر زنی کرتی ہے۔ جو ناسور بن چکے ہیں۔ منوواد، برہمن واد اور جاتی پرتھا کے حوالے سے بھی جو گفتگو ناول نگار نے کی ہے اس میں بھی فکر و نظر کا یہی رویہ کارفرما نظر آتا ہے۔ یعنی بعض سیاسی اور سماجی تحفظات کے پیش نظر ان کی گمراہ کن تعبیر و تفسیر پیش کرنے کی مذموم کوششیں، ان نام نہاد دانشوروں کی دانشوری پر ایک سوالیہ نشان لگاتی نظر آرہی ہیں۔ ''ندی'' شموئل احمد کا ناولٹ ہے یہ عورت اور مرد کے درمیان جذباتی، نفسیاتی اور بالآخر روحانی آویزش کی کہانی ہے یہ

کہانی ایک ایسے ماحول کی عکاسی کرتی ہے جس میں ارمان اور بے حسی کے تصادم سے پیدا ہونے والی پریشان و پشیمان صورت حال افسانوی شکل اختیار کرتی ہے۔ کہانی میں ایک لڑکی اور ایک مرد ہے۔ مرد لڑکی کو حاصل کرنا چاہتا ہے وہ ایک بہ محابا جست لگا کر لڑکی کو سڑک پر بھاگتی کار کے نیچے آجانے سے بچاتا ہے۔ لڑکی اس والہانہ جست کو مردانگی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت مان کر اس سے شادی کر لیتی ہے۔ وہ مرد ایک خاص ضابطہ حیات کا غلام نکلتا ہے اس کے لئے اس ضابطے کا حرف بہ حرف پابند رہنا ہی زندگی کا نصب العین ہے۔ اس کے جذبات بھی ایک خاص وقت کے پابند ہیں۔ اس وقت کے گزرتے ہی وہ بے حس ہو کر رہ جاتا ہے، اور وقت پر جاگنا، وقت پر سونا، وقت پر کھانا، حتیٰ کہ وقت پر بوٹ پالش کرنا ہی اس کی زندگی کا مدعا بن جاتا ہے۔ وقت کے خاص حصے میں ہی وہ اپنے اصول کے مطابق لڑکی کی طرف راغب ہوتا ہے اور اسے بھی دیگر اشیا کی طرح بڑے میکانکی انداز میں برتتا ہے لڑکی کے جذبات اس کے ارمان، اس کی جنسی خواہشات کی بیداری اور اس کی قدرتی مناظر اا ور جنسی حس کے درمیان ہم رشتگی سے لطف اندوز ہونے کی تمنا ہے لیکن مرد کو اس کی رتی بھر پروانہیں۔ وہ ایک خاص ترتیب کا نوکر ہے اور اگر لڑکی اس ترتیب میں فٹ بیٹھتی ہے تبھی اس کے ساتھ اس کا سروکار ہے ورنہ نہیں۔ مرد کے جذبات کا پتھریلا پن اور بے حسی لڑکی کے وفور جذبات سے ٹکراتا چلا جاتا ہے اور بالآخر ان کی رفاقت ختم ہو جاتی ہے جسمانی اور جنسی تلذذ کی کمیابی خودکشی

کرنے پر مجبور ہو جانے کا المیہ شموئل احمد کا کمال ہے موضوع کے چناؤ میں نہیں بلکہ موضوع کے ساتھ زبان ، بیان ، اسلوب ، تکنیک ، احساس ، نفسیات اور مردانگی اور نسائیت کی سطح پر انصاف کرنے میں ہے۔اس ناولٹ کا سب سے بڑا وصف کہانی کا ایک زندہ اور ٹھوس پیکر میں ڈھلتے چلے جانا ہے قصے میں کوئی جھول نہیں ہے اور وہ بالآخر عورت کے روحانی کرب کا استفادہ بن کر قاری کو پریشان کرنے میں کامیاب ہو کر قلم کار کے لیے داد وصول کر کے چھوڑتا ہے۔ یہ ناولٹ قاری کے احساس کے تاروں کو مرتعش کرنے میں کامیاب ہے اور اس کے تجسس کو تازیانہ لگاتا چلا جاتا ہے۔

مشرف عالم ذوقی اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تخلیقات کو عام زندگی کی حقیقتوں ، نفسیاتی کیفیتوں اور پرانی قدروں سے نئی قدروں کے تصادم کے موقعوں سے سجاتے ہیں۔ بقول پروفیسر صغیر افراہیم:

''مشرف عالم ذوقی نے اپنے عہد میں پیش آنے والے درد ناک واقعات اور حادثات کا گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے اور ان پر جو کیفیت طاری ہوئی ہے اسے سچائی سے صفحہء قرطاس پر اتار دیا ہے وہ محض کسی واقعہ یا حادثہ کو بولتی ہوئی تصویر نہیں اتارتے اور نہ ہی بے جا طور پر اپنی کیفیات سے قاری کو باخبر کرا دیتے ہیں''۔[۱]

ان کے نئے ناول ''ذبح'' میں بھی ان کی تحریروں کی یہ خوبیاں اور خصوصیات موجود ہیں۔ذوقی نے اس چھوٹے سے ناول کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

[۱] : چند ہم عصر اردو ناول تقسیم کے حوالے سے، پروفیسر صغیر افراہیم ،اردو کا افسانوی ادب، ۲۰۱۰ء، ص ۳۰۷

یہ ہیں دو پہر، شام، کچھ اپنی کچھ فلک کی (تاریخ)، صبح اور گردش ماہ وسال ''دو پہر'' میں مسلمانوں کی حالت زار کا خاکہ پیش کیا ہے۔ جن کرداروں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ وہ حقیقی زندگی میں بالخصوص قصبات اور ہندمسلم بستیوں کی زندگی میں چلتے پھرتے دیکھتے جا سکتے ہیں۔ ان کرداروں میں جو گفتگو ہوتی ہے اس سے عام مسلمانوں کی فکری اور معاشرتی پسماندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ ''شام'' میں مسلم سماج کی کشمکش اپنی پوری ہیبت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ '' کچھ اپنی کچھ فلک کی'' میں قائم زمین داروں سے پہلے اور بعد کے حالات کا بیان کیا گیا ہے۔ ''صبح'' میں مسلم سماج کی حسرتوں کی عکاسی کی گئی ہے اور'' گردس ماہ وسال'' میں عزم اور ارادے کے استحکام کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہی وہ کشمکش ہے جو غلامی، استحصال اور افلاس کی کوکھ سے جنمی ہے اور'' ہم تیار نہیں ہیں اس طرح بار بار ذبح ہونے کے لیے''۔ کا اعلان کرواتی ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ موصوف متعدد ناول تخلیق کر چکے ہیں۔ ''پوکے مان کی دنیا'' مشرف عالم ذوقی کا تازہ ترین ناول ہے۔ اس ناول پر تسنیم فاطمہ ماہنامہ آج کل شمارہ ۲۰۰۵ کے صفحہ ۴۴ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں پچھلے چند برسوں میں جتنے بھی ناول میرے مطالعہ میں آئے ہیں مشرف عالم ذوقی کا ناول ''پوکے مان کی دنیا'' ان سب میں انوکھا لگتا ہے۔ جیسی تیزی ذوقی کے مزاج میں ہے، ویسی ہی ان کی زبان اور بیان میں بھی ہے۔ عام بول چال کی زبان کو انھوں نے بڑے سلیقہ اور ہنر سے استعمال کیا ہے۔ موضوع کے

اعتبار سے یہ مکمل ناول ہے۔مصنف نے آج کی تہذیب پر گہرا طنز کیا ہے۔آج کے بچے تہذیب سے بے نیاز ہیں ذوقی نے اپنے مزاج کے مطابق ناول میں حقیقت کو بیان کیا ہے۔اس ناول میں درد بھی ہے اور درد کا احساس بھی۔انسانی وجود اس دن سے عمل میں آیا ہے جب کہ اس کو بولنا بھی نہیں آتا تھا، اس وقت بھی دو چیزیں اس کے ساتھ تھیں۔ایک بھوک اور دوسرا ایک دوسرے کو جاننے کا تجسس۔۔۔اور اپنے جذبات کی ترسیل کی خواہش۔خواہ زمانے نے کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلی ہو، کتنے ہی انسانی مدارج کیوں نہ بن گئے ہوں،مگر ترسیل جذبات کی خواہش نہیں بدلی۔اس لئے احساس انسان کے ماحول میں گھٹن محسوس کرتا ہے۔مصنف نے یہی بات ناول کے ہیرو کے حوالے سے کہی ہے۔ناول کا مرکزی کردار سنیل کمار رائے جو کہ ایک جج ہے۔وہ اپنے پیشے کا لبادہ اوڑھ کر جینا نہیں چاہتا۔گھر کے ہر فرد نے یہ بھلا دیا ہے کہ وہ بھی ہماری طرح ہی ایک انسان ہے۔وہ بھی ایک عام انسان کی طرح سوچتا ہے۔اس ناول میں مصنف نے ایک تہذیب کا زوال اور دوسری تہذیب کا عروج بہت خوبصورت انداز میں پرویا ہے۔اسنیہہ اس ناول کی ایک اہم کردار ہے۔اسنیہہ ماضی کا دامن چھوڑتی گئی اور نئی روایتوں کو اپناتی گئی،مگر سنیل کمار رائے نے کبھی بھی اپنے ماضی سے نظریں نہیں چرائیں۔مشرف عالم ذوقی نے زندگی کے ہر پہلو کو دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ غم سارے رشتوں میں گردش کرتا ہے۔دنیا کی ساری خوشی اور سارے غم سب اسی رشتہ کی وجہ سے

ہیں، مگر جب یہ رشتہ اپنے معنی بدلتا ہے ان لمحات کو مصنف نے گہرے سوجھ بوجھ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مصنف کی یہ تخلیق ہمارے آج کے معاشرے کے لئے بھی ایک چیلنج کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں زندگی کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ کبھی کبھی بچوں کے بے بنیاد سوالوں کے جواب اور بے مقصد باتوں میں بھی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ ناول میں غضب کا سسپنس ہے۔ سنیل کمار اخلاقیات کے گڑھے میں پھنسے ہوئے ہیں جب کہ نکھل نے وقت کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں کھینچی ہے۔ اس لئے وہ ہر لمحہ کو جیتا ہے اور نئے زمانے کی تہذیب کو پوری طرح اپنا چکا ہے، مگر سنیل کمار رائے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی روایتوں کا، تہذیبوں کا خون ہوتے ہوئے دیکھے۔ آج کا مشکل ترین زندگی اور بے باک تہذیب کا منظر اس ناول میں بے لاگ پیش کیا گیا ہے۔ کہانی پہلے صفحہ سے ہی آپ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ ۱۲ سال کا ایک بچہ جس نے اپنی ہم عمر لڑکی کی عصمت دری کی۔ فرد سے سماج، معاشرہ، سماجیات اور پھرنگی تہذیب کی گتھیاں ایک کے بعد ایک کھلتی چلی جاتی ہیں۔ دراصل یہ ہماری بدلی ہوئی ایشیائی تہذیب کا دردناک منظر ہے، جہاں مغربی طرز پر چلتے ہوئے ہم اپنی تہذیبی وراثت کو فراموش کر چکے ہیں دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اس تمام جنگ کے پس منظر میں ایک چھوٹا سا بچہ ہے۔ دراصل کہانی کا اختتام ناول کا سب سے خوب صورت حصہ ہے۔ ناول کا اس سے خوب صورت اور چونکانے والا اختتام ممکن ہی نہیں تھا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ سارا ٹرائل، سارا مقدمہ ایک خواب میں

چلتا ہے اور یہ ''ٹرائل'' اس وقت کے انتظامیہ کی بے بسی کا مذاق اڑانے کے لئے کافی ہے۔ ایک طرف بھیانک حقیقت ہے، تو دوسری طرف وہ پو کے مان سے کھیلتا ہے۔ یہ الجھاؤ ذہن کو کئی سوال دیتا ہے۔ ان سوال و جواب کی کشمکش کا انجام بھیانک ہے۔ بکھرتے ہوئے رشتے، ٹوٹتے ہوئے انسان اپنی ہی لاشوں کو کندھوں پر ڈھوتے نظر آتے ہیں۔ ناول کی مجموعی فضاء، مطالعہ کے دوران ہمیں ایک ایسی دنیا میں لے جاتی ہے، جو ہمارے رہنے جینے کے باوجود ہماری دیکھی ہوئی نہیں تھی۔ اردو کے مشہور و معروف دانشور و ادیب آل احمد سرور پیغام آفاقی کے ناول ''مکان'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں رقم طراز ہیں:

''ناول مکان مجھے کئی وجوہ سے پسند آیا۔ یہ عام ناولوں سے مختلف ہے۔ مصنف نے جو موضوع لیا ہے وہ آج کل کے آشوب کا مظہر ہے، مگر اس کو برتنے میں مصنف نے بلندی اور گہرائی دونوں کو چھولیا ہے۔ اس ناول میں جو نفسیاتی اور فلسفیانہ گہرائی ہے، وہ اس ناول کو عام ناولوں سے ممتاز کرتی ہے۔ کہانی تو سیدھی سادی ہے، مگر اس کے ارتقاء میں نیرا، کمار، اشوک، الوک، انکل، سونیا کے یہاں جو اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ وہی اس ناول کی جان ہیں۔ کہیں کہیں کرداروں کی سوچوں میں تکرار محسوس ہوتی ہے۔ شاید یہ عمل ناگریز ہو۔ موجودہ زندگی کی پیچیدگی، تضادات، اخلاقی قدروں کا زوال، بڑھتی ہوئی کرپشن اور اس کے اثر سے تمام اعلیٰ قدروں کا زوال۔ یہ باتیں بہت

کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔ بڑی چیز، ان سب کے باوجود، مصنف کا زندگی کے ثبات اور انسان کی روح پر اعتماد ہے۔ جو پورے ناول کو ایک مجاہدہ بنادیتا ہے۔ جس میں مکان کو محفوظ رکھنے کی جدوجہد انسانیت کی بقاء کی ایک سعی بن جاتی ہے۔ کچھ کرداروں یعنی الوک کا بِک جانا اور اشوک کے یہاں آخری تبدیلی۔ ان کے لیے قاری کو پہلے سے تیار نہیں کیا گیا۔ کم سے کم میرا تاثر یہی ہے۔ یہ تبدیلی اچانک ہوئی ہے۔'' [1]

معاشرتی مسائل اور ناول

اردو ناول میں تنویر جہاں کا نام محتاج تعارف نہیں۔ انہوں نے انسانی زندگی کی فلاح و بہبودی اور معاشرتی اصلاح پر مبنی کئی ناول لکھے ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے چند مغربی ناول نگاروں کے ناول انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ ''عوام کا نمائندہ'' مصنف چھپنوا اچے بے تنویر جہاں کا اسی ضمن کا ناول ہے۔ اس ناول میں ہمیں اپنی کہانی نظر آتی ہے۔ اقتدار حاصل کرنے لے لئے سیاسی جوڑ توڑ اور اقتدار حاصل کرنے کے بعد ذاتی مفادات کا حصول۔ ان مقاصد کے راستے میں آنے والی رکاوٹ کو دور کرنے گھٹیا سے گھٹیا حربے کا استعمال کر کے اپنے آپ کو بہت زیادہ ملوث کرلیا ہے اور اب پیش آنے والے واقعات کو ناول کے مرکزی کردار نے اپنے ملک کی تاریخ بنادیا

[1] : تبصرہ ناول مکان، آل احمد سرور، آج کل شمارہ مئی ۱۹۹۰ء، ص ۴۵

ہے ۔ یہی اس ناول کی خوبی ہے ۔ عام طور پر سیاسی ناول ایک قسم کی دستاویزی فلم بن جاتی ہے ۔اس کے لیے کہا جاتا ہے کہ سیاسی ناول لکھنا بہت مشکل کام ہے لیکن ''اچے بے ''اس تنے ہوئے رسے پر سے نہایت آسانی کے سے گزر گیا ہے ۔عوامی لیڈر نانگا کے ساتھ اس کا تعلق نانگا کی ہونے والی دوسری بیوی کے ساتھ اس کا ربط وضبط اپنے والد کے ساتھ اس کا رویہ اپنی دوست نرس کے ساتھ رات گرازنے کی کوشش اور نانگا کی طرف سے نرس کو اپنانے کی سازش اور پھر نوجوان سیاسی لیڈر میکسن کی سیاسی شکست ، یہ سب واقعات نہایت خوبی کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ۔اس ناول میں اچے بے اپنے ملک یا کسی افریقی یا ایشیائی ملک کے سیاستداں کے چہرے پر سے ہی نقاب نہیں اٹھاتا بلکہ ان ملکوں کے عام آدمی کی ذہنیت کا بھانڈہ بھی پھوڑ تا ہے ۔ اگر سیاست داں بے ایمانی ، بدایمانی ، بددیانتی اور فریب دہی کرتے ہیں تو عام آدمی بھی اپنی سادہ لوحی یا خود غرضی کی بناء پر انہیں امداد و تعاون فراہم کرتا ہے ۔اس سلسلے میں ناول کا مرکزی کردار اوڈیلی کی زبان سے اچے بے کہتا ہے ۔''اگر ہم کہتے ہیں کہ نانگا جیسے انسان جو غربت اور بے قدری سے اٹھ کر اعلیٰ مقام تک پہونچتا ہے ،تھوڑی ترکیب اور کوشش کے بعد اس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ سب کچھ تج دے تو اسے انسانی سرشت سے لاعلمی ہی کہی جائے گی جو آدمی بارش میں بھیگتا اندر آیا ہے ۔اور اس نے اپنے آپ کو خشک کیا ہے ۔اس شخص کے مقابلے میں جو اندر بیٹھا ہے دوبارہ بارش میں جانے پر راضی نہیں

ہوگا۔اور ہم میں سے کوئی بھی ایک زمانہ سے اندر بیٹھا کہ وہ کہہ سکے''جہنم میں جائے سب کچھ۔''اس فلسفہ سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جس مقصد کی طرف اس میں اشارہ کیا گیا ہے۔اسے (چند شخصیات کو) جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا۔ ناول میں فتح آخر کار بدمعاشی اور بددیانتی کی ہوتی ہے۔لیکن جنگ یہاں ختم نہیں ہوتی جاری رہتی ہے اور آخر میں اورذبلی کہتا ہے۔''ایسے نظام حکومت میں انسان اس وقت اچھی موت مرتا ہے جب اس کی زندگی کسی دوسرے شخص کو اتنا متاثر کردے کہ وہ لالچ کے بغیر اس کے قاتل کے سینے میں گولیاں پیوست کردے۔''اچے بے ۱۹۳۰ء میں نائیجریا کے قبیلے ایبو میں پیدا ہوا۔ نائیجریا کے عیسائی قبیلے پڑھے لکھے اور خوش حال تھے۔اس نے نائیجریا کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ پھر ایک طباعتی ادارے کا ڈائرکٹر بن گیا۔۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۶ء تک ریڈیو کا ڈائرکٹر رہا۔ ناولوں کی شہرت کے بعد امریکہ کی میساچوسٹس یونیورسٹی میں لکچرر بن گیا۔ وہاں سے امریکی ریاست کنٹکی کٹ یونیورسٹی میں چلا گیا۔ جہاں وہ ۱۹۷۶ء تک رہا۔وہاں سے واپس نائیجریا آیا اور این سوکا یونیورسٹی میں ادب کا پروفیسر ہوگیا۔آج کل وہ نائیجریا اور این سوکا یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔بیس سال تک اس نے کوئی ناول نہیں لکھا تھا۔۱۹۸۷ء میں اس کا نیا ناول''انتھلس آف سوانا''ہوا ہے۔دنیا بھر کے نقادوں نے اس ناول کو پسند کیا ہے۔اب ایک دو باتیں ترجمے کے بارے میں بھی ہو جائیں۔تنویر جہاں نے اس ناول کا ترجمہ کیا ہے۔ان کی پہلی کوشش ہے اس

اعتبار سے وہ واقعی کامیاب ہیں۔افریقی ادیبوں کا ترجمہ کرتے ہوئے ایک مشکل ضرور پیش آتی ہے۔ یہ لوگ بگڑی ہوئی یا بگاڑ ہوئی انگریزی لکھتے ہیں۔خاص طور سے مکالموں میں ان کا بہت استعمال کرتے ہیں۔اصولی طور پر تو اس کا ترجمہ کیا ہی نہیں جا سکتا لیکن تنویر جہاں نے اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔بڑی ہمت ہے ان کی البتہ گیتوں کا وہ ترجمہ نہیں کرسکیں۔ جو افریقی معاشرے کو سمجھنے کے لیے ضروری تھے۔بہر حال ترجمہ مجموعی طور پر اچھا ہے۔ ناول''میرے نالوں کی گم شدہ آواز''میں جو گاؤں ہمیں ملتا ہے،وہ جیتا، جاگتا،کھاتا، پیتا،،دکھوں سے لبریز اورخوشیوں سے سے معمولی آشنائی والا گاؤں ہے۔اس میں دوستی دشمنی کے ساتھ عیاشی ، چوری،ڈکیتیاں ،اسمگلنگ اور ذرا ذرا سی بات پر جان سے مار دینے کی دھمکیاں ہی نہیں ملتیں بلکہ جان سے مار بھی دیا جاتا ہے اور یہ منظر نامہ محض ناول میں بسنے والے گاؤں کا ہی نہیں آج ہندوستان کے بیشتر قصبوں اور شہروں کے ساتھ گاؤں کا بھی مسئلہ ہے۔ناول کے گاؤں سے گزرتے ہوئے کبھی راہی معصوم رضا کے''آدھا گاؤں'' کی تعزیہ داری اورسوز خوانی کان میں پڑتی ہے کبھی عبدل بسم اللہ کی۔''جھینی ،جھینی ، بینی چدریا'' کا سایہ ذہن پر منڈلانے لگتا ہے۔ناول کی خوبی یہ ہے کہ اس میں زندگی بسر کرنے والے افراد کی ایک ایک حرکت ، ایک ایک دھڑکن پر ناول نگار کی نظر اور پکڑ ہے۔ناول نگار نے اپنی بھر پور تخلیقی صلاحیتوں اور زور دار مشاہدہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سب کو جیتے جاگتے سچے آدمیوں میں تبدیل

کر دیا ہے۔ ناول نگار جس گلی سے گزر رہا ہے پڑھنے والے کو ساتھ ساتھ لئے پھرا ہے۔ جس سے قاری خود کو اس ماحول کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی نہیں مختلف کرداروں ،جیسے سکھریا کا مفلوج ہونا، شبانہ کا اپنی عیاشیوں کے لئے معصوم رخسانہ کا استعمال کرنا،جمیل کی خام ذہنی، آمنہ بیگم کی آنکھوں کی دھندلاہٹ ، شریفن کی فطرت، اکرم الدین کی سادگی، اور ڈاکٹر نجم الدین کی گروہ بندیاں یہ سب بھوگی ہوئی سی لگتی ہیں۔ ناول کے بعد کا حصہ زیادہ محنت اور دلچسپی سے لکھا گیا ہے۔اور اسی حصے میں واقعات بھی اتنی جلدی جلدی اور اس کثرت سے نمودار ہوتے ہیں کہ قاری پوری طرح ناول کی گرفت میں چلا جاتا ہے۔تحریر کی روانی اور سلاست میں اگر کوئی چیز رکاوٹ بنتی ہےتو وہ علاقائی بولی کا اثر ہے۔

پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو ناول کا سفر آج بڑی تیز رفتاری سے جاری ہے کہا گیا کہ ۲۰ ویں صدی افسانے کی صدی تھی اور ۲۱ ویں ناول کی صدی ہے، بالکل درست ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

بابِ سوّم

ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں کا تنقیدی جائزہ
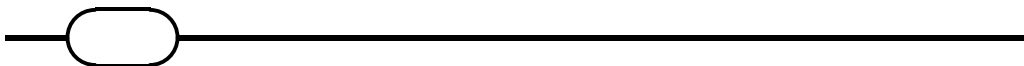
باب سوّم

ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری کا تنقیدی جائزہ

نذیر احمد کی ناولوں کا تنقیدی جائزہ

اردو میں ناول کو متعارف کرنے والے فن کار کا نام نذیر احمد ہے۔ کہا گیا ہے کہ ناول کا فن ایک مخصوص نقطہ ءنگاہ سے زندگی کی تصویر کشی کا فن ہے۔ ناول اپنے عہد کے نوع نہ نوع انسانی تجربات کو فنی سلیقے سے کرنے کا نام ہے۔شاید اسی لیے کہا گیا ہے کہ ناول ہماری زندگی کا آئینہ ہے جس میں ہماری زندگی کے مختلف رنگ جھلکتے ہیں۔کسی نئی صنف کی کسی زبان میں متعارف کرنا بہت کم ادیبوں کے حصے میں آتا ہے ان ہی میں سے ایک نذیر احمد ہیں کیونکہ ناقدین کی اکثریت نے مولوع صاحب کو اردو کا پہلا ناول نویس تسلیم کیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے کل سات ناول سپرد قلم کیے ہیں اوران کے ہر ناول کا موضوع کوئی نہ کوئی معاشرتی مسئلہ رہا ہے یہ معاشرتی مسائل انسانی زندگی کے تجربوں، نظریوں اوراصلاحی اعمال وافکار سے جڑے ہوئے ہیں۔مراۃ العروس، بنات النعش، توبتہ النصوح ،فسانہ ءمبتلا ،ابن الوقت ایامیٰ ،اوررویائے صادقہ ،ان سب میں اصلاح معاشرہ کی جھلکیاں موجود ہیں۔ان سب میں مقصدیت صاف صاف نظرآتی ہے۔لیکن اپنے مقصد کے حصول کے لئے جس نیک نیتی ،خلوص، ہمت اورشدت احساس سے نذیر

احمد نے کام لیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔اپنے افکارونظریات کوفن ناول کے پردے میں جس سلیقے سے انہوں نے انجام دیا اردو کے کسی اور ناول نگار کو یہ موقع نصیب نہیں ہوا۔
یہاں ہم ان کے تمام ناولوں کا تنقیدی جائزہ لیں لیں گے اور ان کی ناول نگاری کے رموز و نکات، فنی عناصر آشکار کرنے کی کوشش کریں گے۔

مراۃ العرُوس

نذیر احمد کو ہی اردو زبان کا پہلا ناول نگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور ''مراۃ العروس'' کو پہلا ناول۔اس کا سن اشاعت ۱۸۶۹ء ہے۔اس کے بعد انہوں نے ''بنات النعش، توبتہ النصوح، فسانہ مبتلا، ابن الوقت، رویائے صادقہ، ایامیٰ'' لکھے۔نذیر احمد نے یہ ناول انگریزی ادب سے متاثر ہوکر لکھئے، لیکن ان کا ایک خاص مقصد بھی تھا۔خصوصاً جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمان اپنا قومی وجود بر قرار رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔نذیر احمد نے اپنے قصوں کے ذریعے سے جمہور کی معاشرتی اصلاحی اور نئی نسلوں، خصوصاً طبقہ نسواں کی تعلیم و تربیت کا بیڑہ اٹھایا۔ان کے ناولوں کی مقصد مسلمانان ہند کی اصلاح اور ان کو صحیح راستے پر ڈالنا تھا لیکن اصلاح کے ساتھ ساتھ انھوں نے اردو ادب کو اپنے ناولوں کے ذریعے بہترین کرداروں سے نوازا۔ان کے ہاں دہلی کی ٹکسالی زبان کی فراوانی ہے۔لیکن ان پر ایک اعتراض یہ ہے

کہ وہ اپنے ناولوں میں ناصح بن جاتے ہیں اور لمبی لمبی تقریریں کرتے ہیں لیکن اُن کے سامنے ایک مقصد ہے اور وہ مقصد فن سے زیادہ اُن کے ہاں اہم ہے۔

اگر چہ 'مراۃ العرؔوس' میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن چونکہ اس سے پہلے اردو میں کوئی ناول نہیں لکھا گیا تھا جو نذیر احمد کے لئے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا۔ پھر بھی نا قدین اسے ایک کامیاب ناول قرار دیتے ہیں۔ آیئے ناول کا فنی اور فکری جائزہ لیتے ہیں :

ناول نگاری میں سب سے اہم جز و کردار نگاری کو کہا جا سکتا ہے۔ مولوع نذیر احمد کے اس ناول کی امتیازی خصوصیت کردار نگاری ہے۔ 'مراۃ العرؔوس' میں بہت سے نمایاں کردار ہیں لیکن چند ایک اہم کرداروں کے نام یہ ہیں۔ دوراندیش خان، اکبری ، اصغری، خیراندیش خان، اکبرا اور اصغری کی ساس، ماما عظمت، محمد عاقل، محمد کامل، محمد فاضل، سیٹھ ہزاری مل، تماشا خانم، حسن آراء، جمال آراء شاہ زمانی بیگم، سلطانی بیگم، سفہن، جیمس صاحب، کٹنی لیکن یہاں پر چند ایک جاندار اور جن کے گرد کہانی گھومتی ہے کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

'مراۃ العرُوس' میں سارا حسن اکبری کے کردار سے پیدا ہوا ہے۔ اکبری کی بدمزاجی ، پھوہڑ پن۔ بدسلیقگی، الہڑ پن اور اس کی بے عقلی کی حرکتوں میں ایک بھولے پن کی وجہ سے اس کہانی میں خوبصورتی پیدا ہوگئی ہے۔ اکبری بے پرواہ لڑکی ہے

اور شادی کرنے کے بعد بھی اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ وہی بچوں والی حرکتیں، اور بچوں والے کھیل۔لیکن اُس کی اس بدمزاجی اور لاڈلے پن میں اس کی تربیت کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہی بدمزاجی اس کے لئے آگے چل کر بہت سے مسائل کا سبب بنتی ہے۔ اکبری اپنے بدمزاجی کی وجہ سے سسرال والوں سے روٹھ جاتی ہے اور اپنے شوہر کو علیحدہ رہنے کو کہتی ہے۔لیکن علیحدہ گھر میں اس کی بے وقوفی اور بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔اور یہاں ایک عورت ایک عورت اس کے سارے زیور چرا کر لے جاتی ہے۔لیکن آخر میں ہم دیکھتے ہیں کہ اکبری جو کسی کی نہیں سنتی تھی واقعات کے تھپیڑوں نے اسے کس طرح ایک گھریلو عورت بنادیا اور پھر اپنی چھوٹی بہن اصغری کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگی۔

مولوی نذیر احمد کا اس ناول میں پسندیدہ کردار اصغری کا ہے۔اور یہی وہ کردار ہے جس کے ذریعے سے نذیر احمد اپنا مقصد بیان کرتے ہیں۔اصغری کا کردار اکبری کا متضاد کردار ہے۔ جہاں اکبری اس ناول میں بدمزاج، بدسلیقہ، بدخو اور احمق لڑکی ہے وہاں اصغری سلیقہ مند، ہنرمند، عقل مند، نرم مزاج، اور شائستہ زبان حوصلہ مند لڑکی ہے۔جس کی سب سے بڑی وجہ اصغری کی تربیت اپنی بڑی بہن کے مقابلے میں بہتر ین انداز میں ہوئی ہے۔

مولوی نذیر احمد نے اصغری کے کردار کو اپنے قلم کے زور سے لکھا اور جو کچھ مولوی نذیر احمد چاہتے تھے عورتوں کی اصلاح کی غرض سے اس نے اس کردار سے لیا

ہے۔ شادی کے بعد اکبری کو مزاج دار بہو کا نام سسرال والوں نے دیا ہوتا ہے جبکہ اصغری کو اس کی ہنر مندی، سلیقہ منداور رکھ رکھاؤ کی نسبت سے تمیز دار بہو کا نام دیا گیا۔ جہاں اصغری اپنے ماں باپ کے گھر میں ہوشیار، ہنر مندی اور رکھ رکھاؤ والی تھی وہاں اپنے سسرال میں بھی اُس نے وہی رنگ برقرار رکھا۔ وہ اپنے سسرال کو اپنی مندی سے قرض داروں سے آزاد کرا لیتی ہے اور ماما عظمت جیسی نمک حرام کا چہرہ سب لوگوں پر واضح کر کے اُسے اپنے سسرال سے نکال باہر کرتی ہے۔ نذیر احمد کا یہ کردار بعض خوبیوں کی بناء پر لا جواب ہے لیکن کردار کی تعریف میں بیگم شائستہ اکرام اللہ لکھتی ہیں:

اصغری کا کردار، سولہ آنے مثالی ہے۔ اس میں دنیا کی ہر ایک خوبی اور صفت پائی جاتی ہے۔ پڑھنا لکھنا، ہنر، سلیقہ، گھر کا انتظام غرض ہر چیز میں اسے ید طولی حاصل ہے۔ اور میکے سسرال دونوں جگہ اس کی قدر و منزلت ہوتی ہے۔

مولوی نذیر احمد کے ناول میں ماما عظمت کا کردار ایک نوکرانی کا ہے۔ یہ مولوی صاحب کے دوسرے کرداروں کی طرح ایک شہرہ آفاق کردار ہے۔ کہانی میں جب ماما عظمت کا کردار آ نکلتا ہے تو کہانی میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب ماما عظمت اپنا رول ادا کر کے پس پردہ چلی جاتی تو کہانی کا مزہ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ اگر سچ کہا جائے تو ماما عظمت کو گھر سے باہر نکال دینے کے بعد کہانی کو ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ کیونکہ کہانی میں ماما عظمت کو چوریاں اور لوٹ کھسوٹ ساری فضاء کو خوبصورت بناتی

ہے۔ قاری اس تجسّس میں ہوتا ہے کہ کب اصغری ماما عظمت کی چوریاں اور لوٹ کھسوٹ کا راز افشاں کرے گی اور جب مناسب موقع پر اصغری ماما عظمت کی ساری کرتوتوں سے پردہ اٹھاتی ہے اور ماما عظمت کو نوکری سے فارغ کر دیا جاتا ہے تو قاری کا تجسّس ختم ہو جاتا ہے۔ خود مولوی نذیر احمد اس کردار کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''اس ماما عظمت کی حقیقت اس طرح ہے کہ یہ عورت پچیس برس سے اس گھر میں تھی۔۔۔۔۔آئے دن اس پر شبہ ہوتا رہتا تھا۔ مگر تھی چالاک گرفت میں نہیں آتی تھی۔ کئی مرتبہ نکالی گئی۔ لیکن پھر بلائی جاتی تھی۔ یوں چوری اور سرزوری ماما عظمت کی تقدیر میں لکھی تھی۔ جتا کر لیتی اور بتا کر چراتی۔ دکھا کر نکالتی اور للکھا کر مکر جاتی۔[1]

دور اندیش خان کا کردار اس ناول کا ضمنی کردار ہے۔ دور اندیش خان اکبری اور اصغری کے والد ہیں۔ وہ پنجاب کے پہاڑی اضلاع میں سرکار انگریزی کی طرف تحصیل دار ہوتا ہے۔ اس ناول میں اس کا کردار صرف شروع اور آخر کے حصے میں خطوط کے ذریعے سے آتا ہے۔ جو وہ اصغری کی شادی کے بعد لکھتا ہے۔ اور اصغری کو نصیحتیں کرتا ہے۔ اس کا آخری خط جو ناول کے آخر میں ہے وہ اصغری کو اس کی اولاد کی وفات پر تسلیاں دیتا ہے۔

محمودہ اصغری کی نند ہے جو کہ ایک سادہ اور معصوم سی لڑکی ہے۔ اس کی تربیت میں اصغری کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس لئے وہ بھی اصغری کی طرح سلیقہ منداور ہنر

[1] مراۃ العروس، مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۵، صفحہ ۸۵۲۔۸۵۱

مند ہے۔ اس کی اسی تربیت کی بدولت اس کی شادی ایک بڑے گھر میں ہو جاتی ہے۔ اور پھر وہ بھی اپنی ازدواجی زندگی میں خوش وخرم رہتی ہے۔

اصغری کی ساس یہ کردار اگر چہ ایک ضمنی کردار ہے مگر اپنے دور کا ایک مکمل نمائندہ کردار ہے۔ یہ اپنے زمانے کی شریف مسلمان عورتوں کی نمائندہ ہے۔ یہ ایک سیدھی سادی سی عورت ہے جس میں نہ اکبری کی طرح پھوہڑ پن اور بدمزاجی ہے اور نہ اصغری کی طرح ہنر مندی اور سلیقہ مندی ہے۔ اس کے علاوہ باقی جتنے بھی کردار رہ جاتے ہیں وہ اگر چہ کہانی کا ایک حصہ ہیں مگر غیر اہم کردار اور ضمنی کردار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نذیر احمد کی ناول نگاری میں کچھ خامیاں ضرور ہیں لیکن جہاں تک فن کردار نگاری کا تعلق ہے وہ اس میدان میں مکمل طور پر کامیاب رہے ہیں انہوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے اردو ادب کو بہت خوبصورت اور بڑے کردار دیئے ہیں۔

مکالمہ نگاری

'مراۃ العروس' میں عورتوں کی زبان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ عورتوں کی زبان کو اپنی بعض مخصوص اصطلاحیں ہوتی ہیں۔ بول چال میں محاوروں، مثالوں اور کنایوں کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ ان کے لب و لہجے میں طنز نمایاں ہوتا ہے۔ عورتوں کا مکالمہ لکھنے کے لئے زبان کو خاص اسلوب سے واقفیت کے ساتھ ان کی ذہنیت اور نفسیات کا ادا شناس ہونا بھی ضروری ہے۔ مولوع نذیر احمد نے اس ناول میں عورتوں کی ذہنی کیفیات،

توہمات اور رجحانات کی ترجمانی ایسے فطری انداز میں کی ہے کہ مکالمہ پڑھتے وقت کرداروں کی آوازیں ہمارے کانوں میں گونجتی ہیں اور ان کے لب ولہجہ کے اتار چڑھاؤ کو ہم محسوس کرتے ہیں۔مثلاً محمد عاقل کی ماں اپنے بیٹے سے کہتی ہے:

''ارے بیٹا یہ بھی کہیں ہونی ہے اشرافیوں میں کہیں بی بیاں چھوٹتی ہیں؟ تم کو اپنی عمران ہی کے ساتھ کاٹنی ہے ہمارا کیا ہے۔قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں، آج مرے کل دوسرا دن'' [1]

پلاٹ

'مراۃ العروس' میں پلاٹ کی کمی محسوس کی جاتی ہے۔کہانی میں تجسس و جستجو کا بہت ہی زیادہ فقدان ہے اس کی اصل وجہ ایک مکمل اور مربوط پلاٹ کا نہ ہونا ہے۔کئی جگہوں پر قاری کے تجسّس میں اضافہ ہوتا ہے۔ان میں سے ایک واقعہ تو ماما عظمت کا ہے۔قاری اُس وقت تک اس سوچ میں لگا رہتا ہے کہ آخر اس کی چوری چکاری کا راز فاش ہوگا یا نہیں اور اگر ہوگا بھی تو اس کے بعد کیا ہو جائے گا۔لیکن اس کے بعد کہانی بہت ہی زیادہ پھیکی پڑی جاتی ہے۔ایک اور جگہ جب بی جٖن اصغری کو بے وقوف بناتی ہے تو اُس وقت بھی قاری کے ذہن میں یہ بات ضرور آتی ہے کہ کیا وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائے گی اور اگر ہوگی بھی تو کس طرح۔ باقی اگر دیکھا جائے تو کہانی میں

[1] مراۃ العروس، مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۵، صفحہ ۸۲۷

تجسّس وجستجو کا فقدان ہے۔

پلاٹ سے مراد کہانی میں مختلف واقعات جن کا آپس میں منطقی رابط ہوتا ہے اور جس سے کہانی کے تانے بانے بنے جاتے ہیں۔اب ہم پلاٹ کی روشنی میں ناول 'مراۃ العروس' کا جائزہ لیتے ہیں۔اگر سچی بات کہی جائے تو مولوی نذیر احمد کے اس کے ناول میں سرے سے پلاٹ ہے ہی نہیں۔کیونکہ پلاٹ کہانی کو تجسّس آمیز او رپیچیدہ بناتا ہے مگر 'مراۃ العرُوس' کی کہانی بالکل سیدھی سادی کہانی ہے۔یہ ایک اصلاحی قصہ ہے جس کا مقصد عورتوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق اور ہنر، سلیقہ پیدا کرنا تھا۔یہ قصہ سادہ الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور اس کو پڑھ کر ہمیں اس معاشرے کے مسلمان گھرانوں اور دلی کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔اس کے علاوہ لوگوں کے رہنے سہنے اور عبادات، رسم ورواج وغیرہ کا حال معلوم ہوسکتا ہے۔

اسلوب

جہاں تک اس ناول کا اسلوب بیان اور اس کی زبان کا تعلق ہے تو اس لحاظ سے نذیر احمد کا ناول ایک اعلیٰ درجے کا ناول ہے۔تمام ناقدین نے اس کی زبان و بیان و اسلوب کو سراہا ہے۔اور اس کی تعریفیں کی ہیں۔مولوی نذیر احمد کو اس سلسلے میں کمال فن کی وجہ سے داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں نے ناول کو بہت ہی سادہ، سلیس، روز مرہ اور با محاورہ زبان میں لکھا ہے۔اس ناول کی زبان دلّی کی عام بول چال کی زبان

ہے۔مولوی نذیر احمد کو اردو پر کافی عبور حاصل تھا اور انہوں نے اس خوبصورتی سے اس ناول کو لکھا کہ اس کی زبان میں شیرینی، لطافت اور مٹھاس، نظر آتی ہے۔تقریباً ایک سو پچاس سال گزرنے کے بعد بھی اس کی زبان ایسی لگتی ہے گویا آج کی زبان ہو۔مثلاً ''جمن نے جان لیا کہ اس کو اچھی چاٹ لگ گئی ہے۔کہا،''تمہارے ڈھب کی کوئی چیز نکلے تو لاؤں''۔دودن کے بعد جھوٹے موتیوں کی ایک جوڑی لائی اور کہا''لو بی، خود بیگم کے نتھ کے موتی ہیں نہیں معلوم ہزار کی جوڑی ہے یا پانچ سو کی۔''[1]

موضوع

تعلیم نسواں نذیر احمد کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد رہا ہے کیونکہ اصغری جیسی اچھی عورتیں ہی کارکن مردوں کو کارہائے نمایاں انجام دینے کے قابل بنا سکتی ہیں اور اکبری جیسی عورتیں مردوں کے لئے ذہنی تکلیف اور پریشانی کا باعث بن جاتی ہیں۔ وہاں کے مرد زندگی میں کوئی ترقی نہیں کر سکتے، کیونکہ ان کا سارا وقت اپنی عورتوں کے مسائل حل کرنے میں گزر جاتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ عورتوں کی اس بے وقعتی کا سبب جہالت کے سوا اور کچھ نہیں، معاشرتی زندگی میں تعلیم اور جہالت، ہنرمندی اور بے ہنری کے نتائج دکھانے کی غرض سے نذیر احمد نے اکبری اور اصغری کی زندگیوں کے دو مثالی نمونے پیش کیے۔

تعلیم نسواں کے بارے میں نذیر احمد کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اتنی تعلیم ہر عورت

[1] مراۃ العروس، مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۵، صفحہ ۸۳۵

کے لئے لازمی ہے جس سے وہ اپنے فرائض خانہ داری کو سرانجام دینے کے لائق بن سکے۔اس تعلیم میں سینا پرونا، کھانا پکانا، پڑھنا لکھنا، حساب کتاب وغیرہ بنیادی اہمیت کی چیزیں ہیں۔لیکن نذیر احمد کے نزدیک عورت کا دائرہ عمل صرف خانہ داری کے معمولی انتظامات تک محدود نہیں۔اسے اپنے شوہر کی مونس وغم گسار اور زندگی کے چھوٹے بڑے معاملات میں اسکی بہترین مشیر و معاون ہونا چاہیے۔ یہ نمونہ وہ اپنے ناول میں اصغری کے کردار میں پیش کرتے ہیں۔کہ اصغری تعلیم خانہ داری پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے شوہر کو زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کرتی ہے۔اور اُسے نوکری کا مشورہ بھی دیتی ہے۔اصغری اپنے شوہر کو سیالکوٹ جانے پر راضی کرتی ہے۔اسی کا پھل محمد کامل کو یہ ملتا ہے کہ وہاں جاتے ہی اس کا افسر جیمس صاحب اُسے دس روپے ماہوار سے تنخواہ بڑھا کر پچاس روپے کر دیتے ہیں۔ پھر اپنے خسر کو نوکری چھوڑنے اور گھر پر بیٹھنے کا مشورہ دیتی ہے۔اور اُسکی جگہ اپنے بہنوئی محمد عاقل کو نوکری پر بٹھا دیتی ہے۔

نذیر احمد نے 'مراۃ العروس' میں اکبری جیسی ناخواندہ عورت کا ذکر کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ ایک ناخواندہ غیر تہذیب یافتہ عورت اپنے گھر اور ساس کے لئے کیا کیا مشکلات پیدا کرتی ہیں۔ وہ ہر وقت اپنی ساس سے جھگڑا کرنے پر تلی ہوئی ہوتی ہے۔ گھر کے کسی کام میں نظم و ضبط لانے کے بجائے بگاڑ پیدا کرتی ہے۔ نذیر احمد کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اگر عورت ناخواندہ اور غیر تعلیم یافتہ ہو تو جھگڑے اور مشکلات

ضرور پید ہونگے ۔ کیونکہ تعلیم ایسی چیز ہے جو انسان میں شعور اور اخلاق پیدا کرتی ہے ۔ تعلیم ہی انسان کو جینے کا ڈھنگ سکھاتی ہے۔تعلیم ہی نظم وضبط اور قاعدہ پیدا کرتی ہے ۔ تعلیم ہی انسان میں حوصلہ اور جرات پیدا کرتی ہے ۔

نذیر احمد یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر تعلیم اور تہذیب نہ ہوتو اکبری جیسی ہزار عورتیں اپنے گھر اور خانداں کے لئے ناسور بن جاتی ہیں ۔ گھر میں ساس اور شوہر سے جھگڑا اُس کا معمول بن جاتا ہے ۔جس سے گھر میں بدنظمی اور فساد پیدا ہوتا ہے ۔ گھر میں انتشار اور آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے ہیں ۔ ناول نگار کا خیال ہے کہ اگر تعلیم ہو، تہذیب اور شعور ہوتو کوئی وجہ نہیں کہ گھر میں امن وسکون نہ ہو اور سکھ چین نہ ہو۔ جسطرح وہ خواتین جن کے نقشے نذیر احمد نے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں ۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہماری سوسائٹی کے لئے آج پھر کسی ''مراۃ العروس'' کی ضرورت ہے ۔ مراۃ العروس میں امور خانہ داری کو موضوع بنا کر نذیر احمد نے اس وقت کے معاشرتی مسائل کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو قابل داد وتحسین ہے ۔ ڈاکٹر طاہرہ بنارسی نذیر احمد کے ناولوں کے تعلق سے اہم بات بتائی ہے :

''حافظ نذیر احمد کے ناولوں میں ایک عام بات پائی جاتی ہے کہ جب ایک چیز کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ضد بھی پیش کرتے ہیں اگر وہ برائی کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو نیکی کا ذکر ضرور کرتے ہیں اس کی مثال ''مراۃ العروس'' میں موجود ہے ۔ اکبری کو

بدسلیقہ بدتمیز دکھایا ہے۔اصغری کو نیک نفس، باتمیز بتایا ہے‘‘۔[1]

قصہ مختصر یہ کہ ’مراۃ العروس‘ کو اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں مافوق الفطرت اور داستانی واقعات کے بجائے ہمارے اپنے حقیقی معاشرے کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اس میں جہاں تعلیم نسواں اور خانگی زندگی کا ذکر ہے وہاں معاشرے کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اس میں جہاں تعلیم نسواں اور خانگی زندگی کا ذکر ہے وہاں معاشرے کی دوسری برائیوں کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے اور اصلاح احوال کی تدابیر بھی نمایاں ہیں اسی میں ناول نگار کی کامیابی کا راز مضمر ہوتا ہے۔

[1] ڈپٹی نذیر احمد، فن اور شخصیت کے چند پہلو، طاہرہ بنارسی، سہ ماہی ہندوستانی زبان، ممبئی، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۳ صفحہ ۲۵

بنات النعش

نذیر احمد کا دوسرا ناول پہلے ناول کی اشاعت کے چار سال بعد یعنی ۱۸۷۳ء میں منظر عام پر آیا۔اس ناول کو اکثر ماہرین نے مراۃ العروس کا ضمیمہ قرار دیا۔ اس کا موضوع حسب سابق ایک معاشرتی مسئلہ امور خانہ داری کی تربیت اور اخلاقی تعلیم ہے۔ڈپٹی نذیر احمد نے تعلیم نسواں کی ضرورت اور اہمیت کو شدت سے محسوس کیا اور اس کے ساتھ ساتھ مغربی تعلیم وطرز زندگی کے نقصانات سے دا سے وہ محفوظ بھی رکھنا چاہتے تھے۔لیکن خواتین کو جدید تعلیم سے آراستہ بھی کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے ''بنات النعش'' میں ہماری معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں بہت موثر اور دلچسپ انداز بیان میں پیش کیا اور اس میں انسانی حیات سے متعلق سائنسی معلومات کو بھی دل نشین پیرائے میں بیان کیا ہے مثلاً علم ثقیل، زمین کی کشش، ہوا کا دباؤ، کشش اتصال، خردبین، زمین کے گول ہونے کی معلومات، مختلف رنگوں کی خصوصیات، آفتاب کے گردش کرنے، متحرک اشیا اور غلط انداز نظر، زمین کا حجم، تقسیم اور ہئیت، آب و ہوا کا مختلف ہونا، جغرافیہ، ہوا کی رفتار، سمندر، بادل، برسات، بجلی، روشنی، علم تاریخ، اجرام فلکی وغیرہ ان سے متعلق معلومات عامہ کو کہانی کی شکل میں آسان وسادہ زبان میں پیش کیا جس کی وجہ

سے بچیوں اور بچوں کی نئی تہذیب اور نئی روشنی کی حقیقی بنیادوں سے روشناس کرایا ہے۔

کردار :

اس ناول کا مرکزی کردار حُسن آرا ہے جو اصغری کے قائم کئے ہوئے اسکول میں تعلیم پا کر زندگی میں کامیابی حاصل کرتی ہے۔حسن آرا ایک دولت مند گھرانے کی بگڑی ہوئی بدمزاج اور غلط کاری کرنے والی لڑکی ہے۔وہ اصغری کے یہاں پڑھنے کے لئے بھیجی جاتی ہے تو اصغری کی نند محمودہ اس کام میں اس کا ہاتھ بٹاتی ہے یہاں زبانی تعلیم کے ذریعے حسن آرا کو پڑھنے لکھنے کی طرف رغبت دلائی جاتی ہے اس میں تعلیم کا شوق پیدا کیا جاتا ہے۔جبکہ اسے اپنے رئیسانہ زندگی اور امیرانہ ماحول پر غرور تھا اس لئے وہ عام لڑکیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی لیکن اصغری کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ حسن آرا میں تمام اچھی قدروں کا احساس پیدا کیا گیا اور آخر کار جب وہ اصغری کے اسکول سے فارغ تعلیم ہو کر رخصت ہوتی ہے تب اس کے کردار میں وہی نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہے جو ایک اچھے کردار میں پائی جاتی ہیں ۔حسن آرا کا مزاج اور کردار دونوں میں نیکی کی اہمیت اور اخلاق قدروں کا احساس جاگزیں ہوتا ہے۔اس ناول میں اخلاق تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ دلچسپ معلوماتی باتیں بھی ملتی ہیں جو قارئین کے دلچسپی کو قائم رکھتی ہیں ۔ان میں خصوصی طور پر بچیوں کی دلچسپی کو مدنظر رکھا گیا ہے اس ناول کے ذریعے معلومات عامہ کی تعلیم دی گئی ہے۔

پلاٹ :

نذیر احمد نے اپنے پہلے ناول کی تخلیق کے دوران ہی یہ لکھا تھا کہ اصغری نے جس طرز پر حسن آرا کو تعلیم یافتہ کیا اس کی ایک جدا کتاب بنائی جائے گی۔ص ۱۱۸۔ یہ جداگانہ کتاب انہوں نے مراۃ العروس کے بعد 'بنات النعش' کے نام سے پیش کی۔ نذیر احمد کے نظریہ تعلیم کو سمجھنے کے لئے ان دونوں ناولوں کو ایک ساتھ پڑھنا چاہیے۔ پہلے ناول سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نذیر احمد مستورات کو صرف حرف شناسی اور امور خانہ داری کی تربیت تک محدود رکھنا چاہتے ہیں اور مدارس میں جو تعلیم کا تصور ابھرا ہے، جس میں جملہ علوم وفنون شامل کیے جاتے ہیں، اس سے لڑکیوں کو بے بہرہ رکھنا چاہتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے وہ علم کو مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کرتے بلکہ اس کو ایک کل کے طور پر دیکھتے ہیں اور اسی کو عقل کی ترقی کی بنیاد قرار دیتے ہیں وہ اپنے ایک کردار سے کہلواتے ہیں :

''عقل واقعی خداداد ہے مگر اس کی ترقی بے علم کے نہیں ہوتی۔ اسی طرح جسم بھی خداداد ہے مگر اس کی توانائی اور بالیدگی غذا پر موقوف ہے۔ عقل کی غذا علم ہے۔ سدافسوس کہ علم ہندوستان سے بالکل اٹھ گیا اور جو ہے وہ جہل سے بدتر۔'' [۱]

[۱] بنات النعش، نذیر احمد، صفحہ ۱۲۹

موضوع :

نذیر نے یہ خیال بھی پیش کیا کہ انگریزوں کی ترقیات اور روے زمین کے بڑے حصے پر ان کی حکمرانی کا راز یہی ہے کہ جو کار آمد ہیں انگریز سب سے زیادہ جانتے ہیں اور اسی علم کی بدولت انہوں نے طرح طرح کی مشینیں ایجاد کیں ہیں جس سے انسانی کام میں بہتری اور تیزی پیدا ہوتی ہے۔ نذیر احمد نے اس منشا کا بھی اظہار کیا ہے کہ جس سماج میں پڑھے لکھے مرد ہوں، وہاں یہ ممکن نہیں کہ اس میں عورتیں جاہل ہوں۔ علم وہ ہنر کا سیکھنا معاشرتی رواج پر منحصر ہے جس معاشرے میں اس کے لئے ماحول سازگار ہوگا، اس میں مرد اور عورتیں سبھی علم و ہنر سیکھتے ہیں۔ نذیر احمد نے اکبر کے مکتب کا ایسا ہی ماحول بنایا ہے کہ اس میں لڑکیاں بڑے شوق و جوق سے علم و ہنر سیکھنے آتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ

''پڑھنا پڑھانا بھی تبھی فائدہ دیتا ہے جب پڑھنے والا خواہش کرے، ورنہ مارے باندھے کچھ پڑھا بھی تو کیا۔ اول تو ایسا پڑھا یاد نہیں رہتا، دوسرے جب دل نہیں چاہتا تو زبردستی کرنے سے الٹا ذہن کند ہو جاتا ہے۔''[1]

نذیر احمد اپنے اہم اور مرکزی کردار کے وسیلے سے علم و ہنر اور دست کاری کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

[1] بنات النعش، نذیر احمد، صفحہ ۱۲۹

''اول علم کا شوق دل میں پیدا کر دیتی ہوں، تب پڑھنا شروع کراتی ہیں''[1]
غرض کہ بنات النعش میں نذیر احمد نے اس بات پر توجہ دلائی کہ ہنر اور سلیقے کے سامنے دولت ہیچ ہے۔ اپنے ہاتھ کے ہنر سے ہم وہ کام کر سکتے ہیں جو دولت سے نہیں کر سکتے۔

☆☆☆☆

توبۃ النصوح

'توبۃ النصوح' ۱۸۷۷ء میں منظر عام پر آیا۔ مولوی نذیر احمد نے اس میں اولاد کی تربیت کیسی کرنی چاہئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے۔ ناول میں اس حقیقت کو روشن کیا گیا ہے کہ محض اولاد کو تعلیم کے زیور سے ہی آراستہ کرنا کافی نہیں ہے بلکہ ان کی پرورش پر بھی خاص توجہ دینی ضروری ہے۔ کہ ان میں دین داری کا جذبہ ابھر کر سامنے آجائے۔ نصوح نے اپنے اولاد کی تربیت پر توجہ نہیں دی تھی۔ ایک مرتبہ شہر میں ہیضہ پھیلا نصوح خود بھی بیمار ہوا۔ وہ خواب دیکھتا ہے کہ حشر کا میدان بپا ہے۔ ہر ایک کے اعمال کا حساب ہو رہا ہے اس موقعے پر نصوح کی جھولی خالی ہے۔ جب وہ خواب سے جاگتا ہے تو اپنے خاندان کی اصلاح کے تعلق سے بے حد فکر مند ہوتا ہے۔ وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اپنے خاندان کو کسی بھی صورت میں بھلائی کی جانب راغب کروں گا اور ان کی

[1] بنات النعش، نذیر احمد، صفحہ ۸

اصلاح کے لئے وہ ہر طرح کی کوشش کرتا ہے۔

کردار :

ناول کا مرکزی کردار نصوح خواب میں میدان حشر بر پا دیکھا ہے تو بیدار ہوکر اپنی اور اپنی کی اصلاح اخلاق کی فکر کرتا ہے۔ اپنے بچوں سے ان کی تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا ہے۔ اس کی اپنے سب سے چھوٹے بیٹے علیم سے جو گفتگو ہوتی ہے وہ اس حقیقت کی کھلی کھلی گواہی دیتی ہے کہ مولوی صاحب نے انگریز حکمرانوں ، ان کے مذہب اور ان کے رویوں کے بارے میں مثبت تصور پیدا کرنے کی دانستہ سعی کی ہے۔

انگریز افسروں نے ناولوں میں جو ترمیمات کروائی تھیں ، وہ شاید اسی نوعیت کی تھیں ۔لیکن اس سے پہلے کہ ہم نصوح اور اس کے بیٹے کے درمیان ہونے والا مکالمہ پیش کریں ، اس وقت کے ہندوستانی معاشرے کی مذہبی صورت حال پر ایک نگاہ ڈال لیں ۔ بنگال پر قبضہ کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے عیسائی مشنریوں کو مقامی ماحول میں تبلیغی سرگرمیاں جاری کرنے کی اجازت دے دی ، چنانچہ مشنریز نے ایک تو پرانے اور نئے عہد نامے کے بعض حصوں کے مقامی زبانوں میں ترجمے کروائے ۔ دوسرے مختلف مقامات پر ایسے اسکول ، کالج اور ہسپتال کھلوائے جہاں تعلیم اور علاج کے ساتھ ساتھ میسیحیت کی تبلیغ بھی کی جاتی تھی ۔ پادریوں کو سکھایا جاتا کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ اور مقامی مذاہب پر تنقید کریں تو شائستگی اور خوش خلقی سے کام لیں۔ ان پادریوں نے مقامی

مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مناظروں کا بازار گرم کر دیا۔اس کا ایک فائدہ سرکار کو یہ ملا کہ عوام کی توجہ سیاسی مسائل سے ہٹ گئی ۔ دوسرے، ان مشنریز کی کوششوں ہی سے بے شمار مقامی مذاہب کے لوگ عیسائیت قبول کرنے پر تیار ہو گئے ۔بعض کے دلوں میں اپنے مذاہب کے لوگ عیسائیت قبول کرنے پر تیار ہو گئے ۔بعض کے دلوں میں اپنے مذاہب کے معاملے میں تشویش پیدا ہو گئی اور وہ عیسائیت قبول کرنے کی طرف مائل ہو گئے ۔ اس کی ایک مثال مولوی نذیر احمد دہلوی تھے ۔ دہلی کالج میں حصول تعلیم کے دوران انہیں ماسٹر رام چندر سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ ماسٹر صاحب نے ہندومت چھوڑ کر مسیحیت اختیار کر لی تھی ۔ وہ اپنی ذات میں نہایت شائستہ اخلاق اور صاحبِ علم آدمی تھے ۔ مولوی صاحب اپنے استاد سے اتنے متاثر تھے کہ ''مذہب تبدیل کرنے میں واقعی سنجیدہ ہو گئے''۔ڈاکٹر نیئر کے اس جملے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے ان سے پوچھا: آپ کے پاس اس دعوے کا کیا ثبوت ہے؟ کہنے لگے، آپ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کا مولوی نذیر احمد دہلوی پر لکھا ہوا پی ایچ ڈی کا مقالہ دیکھ لیں۔ اتفاق سے مجھے یہ کتاب مجلس ترقی ادب سے مل گئی ۔ ڈاکٹر صدیقی مولوی نذیر احمد دہلوی کے ایک لیکچر کا اقتباس پیش کرتے ہیں، جس میں مولوی صاحب کہتے ہیں:

''مجھ کو ماسٹر صاحب کے ساتھ ایک خصوصیت بھی تھی اور اکثر ان کے مکان پر بھی جانے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ماسٹر صاحب نے تو مجھ کو گمراہ کر دیا ہوتا مگر مجھ کو ادب عربی کا شوق بہت تھا، مَیں قرآن کی عبادت پر لٹو تھا۔ اس تریاق نے مجھ کو اس زہر سے بچایا۔ یہاں تک کہ کالج سے مَیں اپنا ایمان سلامت لے کر نکل گیا۔مگر کیسا

ایمان، متزلزل، متشکک۔ضعیف، مضمحل !''[1]

ڈاکٹر صدیقی لکھتے ہیں، انہوں نے مذہبی تشکیک اور عقائد کے متزلزل ہونے کا تو ذکر کیا ہے لیکن اصل بات گول کر گئے ہیں یعنی عیسائیت کی طرف اپنے میلان کا اعتراف نہیں کیا البتہ بعد میں انہوں نے اپنے ایک ناول ''صادق کا مذہبی خواب'' میں قصے کے ہیرو صادق کی زبان سے اپنی اصل کہانی بیان کر دی۔ صادق کہتا ہے:

''میرا بھی قریب قریب تمہارا ہی حال تھا، بلکہ شاید اس سے بھی بدتر۔۔۔ میں ایک دیندار کے گھر میں پیدا ہوا۔۔۔شامت جو آئی تو مجھ کو سرکاری کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ باوجود کہ کالج پادریوں کا نہیں، بل کہ سرکاری تھا اور اس میں دین و مذہب سے کچھ بحث نہ تھی اور میں انگریزی بھی نہیں، بل کہ عربی پڑھتا تھا۔ تاہم چونکہ ہر قسم کے آدمیوں سے ملنا جلنا ہوتا تھا، مخالف آوازیں کان میں پڑنے لگیں۔ بہت دن نہیں گزرے تھے کہ میرے مذہبی خیالات میں تزلزل پیدا ہونا شروع ہوا۔ نماز پہلے گنڈے دار ہوئی، پھر ندارد، اور ''خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری'' دو چار بار بڑوں کے لحاظ سے پڑھنی پڑھی تو بے وضو ہی ٹرخا دی، پھر عیسائیت کی طرف رجحان ہوا تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ ریائی نمازوں کی التحیات ''اشھد ان محمداً عبدو رسولہ'' کی جگہ ''اسھد ان عیسیٰ ابن اللہ'' کہنے لگا، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خدا اور خدا کا بیٹا ہونا دل میں کچھ اچھی طرح جمتا نہ تھا۔ غرض میں کسی وقت عیسائی تھا، کسی وقت مسلمان، کسی وقت کچھ بھی نہیں۔۔۔ اسی حیص بیص میں کئی سال گزر گئے''۔[2]

[1]: بنات النعش، نذیر احمد، صفحہ ۹

[2]: توبۃ النصوح، نذیر احمد، صفحہ ۹۸

فسانہء مبتلا

ڈپٹی نذیر احمد کا یہ چوتھا ناول ہے۔اس کی اشاعت ۱۸۸۵ء میں ہوئی۔
اس کا موضوع تعدادِ ازدواج یعنی ایک سے زیادہ شادیاں۔اس ناول میں نذیر احمد نے اس کی خرابیاں ظاہر کیں ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار مبتلا ہے جس کی تربیت اس طریقے سے نہیں ہوتی۔اس کے والدین اس کی شادی یہ سوچ کر کرتے ہیں کہ شادی کے بعد شاید وہ سنبھل جائے۔لیکن وہ ایک عورت ہریالی کو ماما بھیس میں گھر لاتا ہے۔آخر ایک دن راز کھل جاتا ہے۔اور سوتنیں آپس میں لڑنے لگتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مبتلا گھٹ گھٹ کر مر جاتا ہے۔

موضوع

نذیر احمد اصلاح کے معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہیں وہ کبھی ایسا نہیں کرتے کہ جس کو چاہا پکڑ کر اس کی اصلاح کر دی ان کے فن پر شعری انصاف کا اصول بھی لاگو نہیں ہوتا کہ اچھے کا انجام اچھا اور برے کا انجام برا دکھائیں۔ان کا مقصد و منشا مصنف کا نہیں مصلح کا ہے وہ اصلاح کے حقیقی امکانات پر گہری نظر رکھتے ہیں فسانہء مبتلا کے اس کردار سے اس کی وضاحت ہوتی ہے :

''حضرت یہ تو علم اخلاق کا ایک بڑا ضروری مسئلہ ہے جتنی باتیں طبعی ہیں یعنی تقاضائے طبیعت انسانی سے سرزد ہوتی ہیں کسی کے روکے رک نہیں سکتی ہیں۔ ان کی تبدیلی میں کوشش کرنا محض لا حاصل ہے اور مطلق بے سود۔ مگر جن کو میں نے شخصی سے تعبیر کیا ہے ضرورتیں ہیں ادعائی، حاجتیں ہیں تکلفی، جن کو آدمی عموماً نہیں بلکہ افراد خاص اپنے اوپر لازم کر لیتے ہیں۔ اگر چہ ان ادعائی ضرورتوں کا تقاضا کبھی طبعی ضرورتوں سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے مگر پھر بھی چونکہ تقاضائے طبیعت نہیں ہے، اس کے شورشکو فرد اس کی تیزی کو مدھم کرنا ممکن ہے'' [1]

''نذیر احمد کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے کرداروں کے نام ان کی اخلاق حالت کے مطابق رکھتے ہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مشاق فن کار ہیں: فسانہ مبتلا کا یہ اقتباس دیکھیے:

''ڈاکٹر چنبیلی کا نام اصل میں مس بیلی تھا ولایت سے نئی آئی ہوئی تھی کہ اس نے نواب اقتدار الدولہ بہادر کے محل میں ایک بڑے معرکے کا علاج کیا۔ تب ہی سے شہر میں بڑی شہرت ہوئی۔ نواب صاحب کی محل سرا میں اس کو چنبیلی چنبیلی پکارتے تھے وہاں کی سنی سنائی اور لوگ بھی چنبیلی کہنے لگے دار یہ گیری کے فن میں نہایت تجربا کار اور مشاق تھی'' [2]

۱: توبتہ النصوح، نذیر احمد، صفحہ ۹۹

۲: فسانۂ مبتلا، نذیر احمد، صفحہ ۱۱۸۔۱۱۹

کردار :

درج بالا اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نذیر احمد نے کردار کا اصلی نام اس کے پیشے کے مطابق رکھا۔ انگریزی میں لفظ بیلی کے معنی ہیں پیٹ۔ پھر اس کا ترجمہ لفظی مناسبت کی وجہ سے اردو میں چنبیلی کر دیا۔ ان کے تمام ناولوں میں جن اشخاص کے نام محض ایک جملے یا ایک فقرے میں آئے ہیں وہاں بھی انہوں نے یہی احتیاط برتی ہیکہ پیشے کے اعتبار سے ان کا نام رکھا ہے۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس سے پہلے اردو میں یہ طریقہ رائج نہیں تھا۔ کچھ اور مثالیں یہاں پیش کی جاسکتی ہیں :

''کھار میں ایک دو بیگھے کا کھیت بھو مالو نیے کا ہے۔''[1]

''کیوں کیا جاگا جو کیدار سے ڈرتا ہے۔''[2]

کرداروں کو نام دینا کردار سازی کا پہلا مرحلہ ہے اوپر کی مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ نذیر احمد نے اس مرحلے کو بڑی فن کاری سے طے کیا ہے۔

فن کار کا کمال یہ ہے کہ وہ کردار کی گفتگو اور لب ولہجہ سے نہ صرف معاشرے اور سماج میں اس کی حیثیت اور خاندانی مراتب ظاہر کرے بلکہ جو حوادث یا واقعات درپیش ہوں اور اس دوران وہ جن جن کیفیات اور ذہنی کروٹون سے گزر رہا ہو اس کو عیاں بھی کر دے۔

۱: فسانۂ مبتلا، نذیر احمد، صفحہ ۱۸۳

۲: فسانۂ مبتلا، نذیر احمد، صفحہ ٦۵

مکالمہ نگاری:

'فسانہ ءمبتلا' میں بعض مقامات پر بڑے بلیغ اور کارآمد مکالمے ملتے ہیں جن سے نذیر احمد کی ظرافت عیاں ہوئی ہے۔ مبتلا جو فسانہ ءمبتلا کا مرکز کردار اور ہیرو ہے، اس کی پانچ بہنیں ہیں وہ ان پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوا ہے۔ اس لیے اس کی پرورش ان نازو انداز سے ہوئی ہے کہ دنیا کا کوئی اندیشہ، کوئی غم انکے قریب ہو کر نہیں گزرا۔ ناز و نعم میں نو جوانی تک پہنچا شادی ہوئی، شادی کا ہونا تھا کہ مبتلا پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور بقول نذیر احمد اس کی نامرادی و بربادی کی پہلی منزل اس کے حسن کا زوال تھا نذیر احمد نے اس سنجیدہ واقعے کو بھی محاوروں کے استعمال اور الفاظ کو ڈھنگ سے پیش کر کے مزاحیہ پہلو نکالے ہیں۔ اسی طرح ہریالی کو مبتلا کا بعد از نکاح گھر میں لانا اور ہریالی کا ماما بن کر دبے پاؤں گھر میں آنا اور اس کے بعد کے واقعات بڑے لطیف ہیں۔ رات کا وقت ہے مبتلا ہریالی کو اپنے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر مردانے میں چلے جاتے ہیں اور مبتلا کی پہلی بیوی غیرت بیگم روشنی میں جب ہریالی کا چہرہ دیکھتی ہے تو ڈر جاتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھیے:

''غیرت بیگم دیکھنے کے ساتھ اس طرح ڈر کر پیچھے ہٹیں کہ جیسے کوئی بچہ بیچا سے بھاگتا ہے اور لگیں کہنے اوئی یہ ماما کس قسم کی ہے۔'' [1]

''ہمسایے تک کی عورتیں گھر میں آ بھریں اور سب نے مل کر بیگم کا ایسا بڑا ہدڑا کیا کہ دوپٹہ اتارے لیے جاتا تھا کوئی پیچھے سے چوٹی گھسیٹ رہا ہے۔'' [2]

[1]: فسانۂ مبتلا، نذیر احمد، صفحہ ٦٦

[2]: فسانۂ مبتلا، نذیر احمد، صفحہ ١٥٥

نذیر احمد اردو کے ان ناول نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے اردو ناول کو ایک مستحکم روایت عطا کی۔اس روایت کو آگے چل کر ہمارے بڑے بڑے ناول نگاروں نے اپنایا ہے۔اس سلسلے میں یوسف سرمست کا یہ قول ملاحظہ فرمائیں:

''انھوں نے اردو ناول نگاری کو بعض ایسی صحت مند مستحکم روایات دی ہیں کہ آج بھی اردو ناول کسی نہ کسی حد تک فائدہ اٹھا رہی ہے۔''[۱]

اس ناول میں رومان،معاملات عشق،حسن پرستی اور شادی کے مسائل سے متعلق خیالات کے علاوہ جنسی بے راہ روی پر بھی تبصرہ ملتا ہے۔نذیر احمد نے جنسی بے راہ روی کو کسی نفسیاتی الجھن یا جنسی محرومی کو کسی ہیجانی انداز میں پیش نہیں کیا بلکہ اعتدال،معقولیت اور واقعت کا لباس پہنایا ہے۔وہ عہد جدید کی عریاں لذتیت اور خیالی رومانیت کی تصویر کشی نہیں کرتے۔اس کے علاوہ ایسا بھی نہیں کہ نذیر احمد حسن کی دل فریبیوں اور عشق کی سرگرمیوں سے بے بہرہ تھے۔ہاں وہ قدرے بے نیاز ضرور تھے اور اس بے نیازی کی وجہ ان کا سیرت پرست ہونا تھا۔وہ حسنِ صورت کو ایک عارضی اور ثانوی حیثیت دیتے تھے اور حسن سیرت کو ایک دائمی قدر جانتے تھے۔وہ بچوں کے اخلاق کا خیال کرتے ہیں ان کی اخلاقی تعلیم کو بڑی اہمیت دیتے تھے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''مبتلا کا تو حال یہ تھا کہ جو شعر عاشقانہ ایک بار بھی اس کی نظر سے گزرا دیکھنے کے ساتھ ہی کالنقش فی الحجر ہو گیا۔غرض فیضان مکتب سے حضرت میں ایک صفت

[۱] فسانہء مبتلا،نذیر احمد،صفحہ ۱۵۵

اور پیدا ہوئی یعنی عاشق مزاجی۔'' [1]

فسانہ ءمبتلا نذیر احمد کا ایک کامیاب ناول ہے اور اردو کے بعض ناقدین کے نزدیک تو یہ ان کا سب سے بہترین ناول ہے۔ مثلاً ڈاکٹر سید عبد اللہ، فسانہ ءمبتلا کے متعلق سے یوں رقمطراز ہیں:

''فسانہ ءمبتلا' میں مقصد سے دل بستگی کا وہی عالم ہے جو مصنف کے اور ناولوں میں ہے مگر فن کے اسرار و رموز پر عبور کے معاملے میں اس کو ہم نذیر احمد کا شاید مکمل ترین قصہ کہہ سکتے ہیں۔'' [2]

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ناول میں نذیر احمد کا ایک نیا شعور ابھرتا نظر آتا ہے اور فن ناول نگاری میں بتدریج ارتقاء بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس ناول میں نئے کردار اور ان کی زندگیوں کے نئے مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نذیر احمد کا شعور آہستہ آہستہ اپنے عہد کی تبدیلیوں کو گرفت میں لا رہا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ وہ پرانی قدروں اور وضعداریوں کو اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہتے تھے مگر ساتھ ہی بدلتے ہوئے نظام اور عہد نو کی دھندلی جھلک بھی دیکھ رہے تھے اور ان کا ضمیر نیک نیتی سے کچھ چیزوں کو قبول کر رہا تھا اور کچھ چیزوں کو رد بھی کر رہا تھا۔ انہیں کسی طرح یہ گوارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ناولوں کے پلاٹ کی بنیاد انحطاطی دور کی غیر صحت مند لذتیت اور عشقیہ شاعری پر رکھیں یا داستانوں کی خیالی اور غیر اخلاقی رومانیت سے اپنے

[1] بیسویں صدی میں اردو ناول، یوسف سرمست، صفحہ ۱۳

[2] فسانہ ءمبتلا، دوسری فصل، آخری سطر

قصوں میں بھی لطف ولذت پیدا کریں اور یہ سب کچھ ضروری نہیں ہے۔ انہیں نے جس معاشرے میں آنکھیں کھولی یا جس ماحول کے وہ پروردہ تھے اسی معاشرے کی زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا اور اسی مخصوص متوسط طبقے کی عکاسی کی۔

غرض کہ 'فسانہء مبتلا' نذیر احمد کا ایک کامیاب اور فن کے اعتبار سے مکمل ناول ہے جسے ارباب ذوق اور احباب تنقید نے توقیر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اس کا پلاٹ پختہ ہے۔ مکالمے حسب مقع ہیں، اور فطری معلوم ہوتے ہیں، منظر نگاری میں بھی یہ کامل ہے۔

ابن الوقت

یہ نذیر احمد کا سب سے مقبول ترین ناول ہے۔ اس کی اشاعت ۱۸۸۸ء میں ہوئی۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ دوسروں کی نقل کرنے والا آخر کار ناکام ہوکر بہت پشیماں ہوتا ہے۔ ابن الوقت نے انگریزوں کی نقالی کی۔ اس کے بھائی حجت السلام نے بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانا آخر کار اس کو اپنی روش پر شرمندہ ہونا پڑا بعض علمائے ادب کا خیال ہے کہ ابن الوقت کے پردے میں سر سید پر چوٹ کی گئی ہے اور حجت اسلام کے پردے کے پیچھے خود مولوی نذیر احمد ہیں۔

عنوان:

اس ناول کا عنوان ناول کے کردار کے نام پر کھا گیا ہے۔ابن الوقت دراصل ناول کا مرکزی کردار ہے۔اس کردار کی عادتیں اور خصلتیں دراصل سرسید سے بہت میل کھاتی ہیں۔مثلاً دہلی کے شاہی قلعے سے نسبت ہونا، غدر میں انگریزوں سے ہمدردی رکھنااور ان کو پناہ دینا، اس خدمت کے صلے میں ملازمت اور جاگیر پانا،انگریزوں کی صلاح پر مسلمانوں کے لئے اصلاحی پروگرام بنانا،مولویوں کی طرف سے فتوے صادر کرنا،غدر کے حالات مرتب کرنا،مسلمانوں کو سزاؤں سے نجات دلانا اوران کو بے قصور ثابت کرنا اوراسلامی احکامات کی نئی نئی تاویلات کرنا وغیرہ۔اس کے علاوہ انھوں نے ابن الوقت اورسرسید کی تعلیمات میں مماثلت قائم کر کے ان دونوں کو کافی قریب کر دیا ہے جس کے ذریعے حجتہ الاسلام ابن الوقت کی یہ غلطیاں بتاتا ہے:

''اول تم نے سرے سے یہی غلط سمجھا کہ نوکریوں سے مسلمانوں میں خوشحالی آئے گی۔ پھر دوسری غلطی تم سے یہ ہوئی کہ مسلمانوں اورانگریزوں میں اختلاط پیدا کرنے کے لیے تم نے انگریزی وضع اختیار کی۔ رہا دین اس کا تم نے تمہارے اتباعیوں نے مل کر ایسا استخاف کیا کہ ''بالیش بابا ہم بزی'' کی بھی کچھ حقیقت باقی نہیں رہی''[1]

[1] سرسیّداوران کے رفقاء،صفحہ ۲۸۰

دراصل 'ابن الوقت' ان تمام افراد کا نمائندہ ہے جو ہوا کے رخ پر چلنا چاہتے ہیں اور جونئی قوتوں سے مفاہمت اور مصالحت کر لیتے ہیں اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ اس کے نتیجے میں انھیں اپنی تہذیب کو فراموش کرنا پڑے۔

کردار:

'ابن الوقت' ایک متمول گھرانے کا تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ انگریزوں اور ان کی تعلیم و تہذیب سے وہ بہت متاثر ہے۔ غدر کے ایام میں وہ ایک انگریز حاکم نوبل صاحب کو پناہ دیتا ہے۔ اسے انگیریزی سرکار سے اس کے صلہ میں بڑی جاگیر اور ایک بڑے عہدہ پر ملازمت بھی مل جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ انگریزی وضع سے زندگی بسر کرتا ہے اس کے اس طرح انگریزی وضع اختیار کرنے سے ہندوستانی تو اس سے نفرت کرنے لگے تھے لیکن بعض انگریزوں وضع سے نفرت تھی ان میں مسٹر شارپ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ہندوستانی انگریزوں کی وضع اختیار کرے۔ شارپ ابن الوقت سے ذاتی بغض و عناد کی وجہ سے جلتا بھی ہے اور نوبل صاحب کے انگلستان جانے کے بعد وہ ابن الوقت کو بہت تنگ بھی کرتا ہے۔ ابن الوقت کا اس کے ہندوستانی ساتھیوں اور اس کے رشتہ داروں کی جانب سے سماجی بائے کاٹ کیا جاتا ہے اس دوران اس کے بہنوی حجتہ الاسلام بھی اس سے بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ اس طرح

جو ذہنی طور پر انگریزی آداب و معاشرت سے تنگ آچکا تھا ایک روز ہندوستانی لباس میں اپنی ساس سے ملنے چلا جاتا ہے۔

نذیر احمد کے دوسرے تمام ناولوں میں سب سے نمایاں مقام ابن الوقت کو حاصل ہے کیوں کہ ابن الوقت میں نذیر احمد کی ناول نگاری کے اچھے گن اوران کی فن کاری کے جوہر صاف نظر آتے ہیں اس ناول میں انہوں نے ابن الوقت کے کردار اکبری یا نصوح کی مانند اسے بنانے سنوارنے کی کوشش نہیں کی اس لئے ابن الوقت ایک جامد کردار نظر آتا ہے۔ ناول کا عنوان ابن الوقت ایک علامت بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے تعلق سے سلیم احمد کی رائے ہے :

''ابن الوقت ایک علامت کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ آج ہمارے لئے انگریزی لباس روزمرہ کی حقیقت ہے مگر ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے لئے یہ بہت بڑا تمدنی مسئلہ بھی تھا اور نذیر احمد نے اس جذباتی فضا کی اچھی عکاسی کی ہے۔''[۱]

اس ناول میں دو تہذیبوں کے مابین ٹکراؤ کی بہترین عکاسی کی گئی ہے وہ اس متوسط طبقے کا نمائندہ ہے جو جاگیرداروں، درباراروں اورنوابوں کے زوال کے بعد میدان عمل میں آیا تھا جسے اس بات کا اب اندازہ ہوچکا تھا کہ بہتری حالات سے مفاہمت میں ہے نہ کہ مقادمت میں۔ حجتہ الاسلام کا کردار ابن الوقت کا متضاد ہے۔ وہ پرانی تہذیب کا دلدادہ ہےاس کی نظر میں نئے تہذیب وتمدن کواپنانا قدیم روایات کے

[۱] نذیر احمد کے ناول: تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر اشفاق محمد خان، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۰، صفحہ ۱۵۸

خون کے مترادف معلوم ہوتا ہے۔

پلاٹ:

ناول کا پلاٹ زیادہ مربوط نہیں ہے لایعنی بحثوں اور بے جا تقریروں کی وجہ سے ناول غیر ضروری طور پر طویل ہو گیا۔ تقریباً پونے چار سو صفحات پر پھیلا ہوا یہ ناول ہے لیکن چاہے تو اسے چند صفحات میں سمیٹا جا سکتا تھا۔

نذیر احمد کو مکالمہ نگاری میں بڑا کمال حاصل تھا۔ ناول کے ہر کردار کے ساتھ اس معاملے میں انہوں نے انصاف کیا ہے۔ کس کردار کی زبان سے کون سے الفاظ میں اور کس طرح کی زبان میں ادا کرنا چاہیے وہ خوب جانتے ہیں۔ اس کی وجہ ان کی قوت مشاہدہ کا زبردست ہونا تھی۔ انہوں نے اپنے دور کے حالات کا بڑی گہری نگاہ سے مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے اس ناول کے ذریعے جو نتائج برآمد کیے وہ بالکل درست ثابت ہوئے ہیں۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے مغربی علوم اور انگریزی تعلیم جب پوری طرح پھیل جائیں گے تو اس میں آزادی افکار، جمہوریت اور اخلاق کے جو اسباق ملتے ہیں ان سے اذہان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

'ابن الوقت' نذیر احمد کا سب سے جاندار کردار ہے۔ ناول کا مرکزی کردار ہونے کی وجہ سے سبھی کردار اسی کے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ کہانی کا تانا بانا اسی کردار کے ارد گرد بنا گیا ہے۔ نذیر احمد نے اس کردار پر بڑی محنت صرف کی۔ ابن

الوقت اپنے وقت کے اچھے طلباء میں شمار کیا جاتا تھا۔ مدرسے میں اس کا پسندیدہ مضمون تاریخ تھا۔ تاریخی کتابوں کے لیے وہ مطبع سلطانی میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ مطالعہ کی وجہ سے ہر مضمون میں ایک نقرئی تمغہ حاصل کیا کرنا تھا۔ ابن الوقت موقع ملتے ہی پرانی دلی کے کھنڈروں میں اپنی تعطیل کے اوقات صرف کرتا۔ جب کبھی غیر ملکی عوام شہر میں آتے تو وہ ان سے بڑے جوش وخروش سے ملتا اور ان کے ملک کی تہذیب وتمدن اور وہاں کے رہن سہن اور عادات واطوار دریافت کرتا۔ ابن الوقت کا حافظہ زبردست تھا۔ خصوصاً تاریخی معلومات کے تعلق سے وہ بہت آگے تھا۔ اس بات کی تصدیق یوں کی جاسکتی ہے کہ جب وہ مسٹر نوبل کے ساتھ کھانا کھا کر آتا ہے تو گھر والے اسے کرسچن سمجھنے لگتے ہیں لیکن وہ دلائل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ کھانا کھانا کوئی ناجائز کام نہیں ہے۔

موضوع :

ناول میں نذیر احمد نے 'ابن الوقت' کو روشن خیال اور قابل قدر بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ حجۃ الاسلام کو ناقدین نے شبلی اور نذیر احمد کا پرتو قرار دینے کی کوشش کی لیکن دراصل یہ بھی ناول میں علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے درمیانی گروہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کے پس منظر میں مسلمانوں کا قدامت پسند گروہ ہے۔ حجۃ الاسلام کے طویل مکالموں پر بجا طور پر اعتراض کیا گیا ہے اس کی طویل اور

دقیق گفتگو کا احساس نذیر احمد کو خود بھی ہو گیا تھا۔ اسی لیے وہ ابن الوقت کے ذریعے یہ کہتے ہیں :

''آپ نے تو ناحق ڈپٹی کلکٹری کی آپ کو تو سلطان الواعظین ہونا چاہیے تھا۔''[1]

ناول میں ابن اوق کے مکالموں کا بغور جائزہ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ابن اوقت کے مکالمے مختصر اور معنی خیز ہیں اور ان میں مغربی تہذیب کی دلکشی بھی ہے ۔ ناول میں ابن الوقت کی ایک پھوپی بھی ہیں اور ان کا کردار بڑا متحرک اور جاندار ہے حالانکہ یہ کردار مختصر عرصے کے لئے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن نذیر احمد نے اسے فطری بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ کردار ان ظیعف عورتوں کی نمائندگی کرتا ہے جو گھر کے باہر کی دنیا اور اسکے معاملات سے کچھ سروکار نہیں رکھتی ہیں۔ کون حاکم وقت ہے کون نہیں انہیں اس سے کوئی لینا دینا نہیں۔ لیکن جب بھی گھر کے کسی فرد پر ئی مصیبت آتی ہے سب سے زیادہ پریشان یہی ہوتیں ہیں۔ اس کی یہ بے خبری کافی دلچسپ ہے کہ وہ کمپنی کو بادشاہ زادی کی بیٹی سمجھتی ہے اور ابن الوقت کی پریشانیوں کو دیکھ کر کہتی ہے کہ کمپنی کی شکایت بادشاہ زادی سے کرنی چاہیے۔ اس کردار کی دلچسپی سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ اس ناول میں وہ حجۃ الاسلام کی خوش دامن ہیں اس طرح وہ ناول کے دو اہم کرداروں کے درمیان ایک دھاگا یا رشتہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ناول کا ایک اہم کردار جانثار ہے جو اس لحاظ سے اہم ہے۔ غدر میں نوبل صاحب کا ملازم ہونے کے ناطے ان کا ساتھ دیتا ہے اور اپنی

[1] : مقدمہ مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد، سلیم احمد، فرید بک ڈپو، دہلی، جولائی ۲۰۰۵، صفحہ ۳۵

وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔ یہی ابن الوقت اور اس کے ساتھیوں کو اپنے زخمی صاحب کی طرف متوجہ کرتا ہے اور ان کے ساتھ نوبل صاحب کو ایک محفوظ جگہ پہنچاتا ہے۔ یہ کردار ان شاگرد پیشوں کی نمائندگی کرتا ہے جو انگیز حاکموں کے خسمت گار رہوا کرتے ہیں اس کی ایک حیثیت ابن الوقت کے مشاطہ کی بھی ہے اسی کے ذریعے ابن الوقت انگریزی وضع کا مکمل نمونہ بنتا ہے۔ ناول میں ابن الوقت کے بیانیہ حصے اور اس کی تقریریں بہت اہم ہیں جس اس وقت کے ہندوستان کی خاص کر مسلم معاشرہ کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے ولی عہدی کے لئے کشمکش، سیاسی حالات، زرعی نظام، صنعت وحرفت، ہندوؤں اور مسلمانوں کے حالات، مشینی اور صنعتی انقلاب کے اثرات، مہاجنی، کسانوں کے حالات ،مختلف طبقہ اور پیشہ کے لوگوں کے حالات، یہاں تک کہ اس میں شجرکاری، موسمیات اور اس وقت کی گرانی اور اشیاء کی قیمتوں کے متعلق بھی بیان ملتا ہے۔

ناول میں انگریزوں کے دو کردار ہیں۔نوبل صاحب نیک نیت ہیں اور بڑے تیز، ذہین وفطین بھی ہیں۔اس ناول میں نذیر احمد نے اپنے بعض تجربات کو پیش کیا ہے جو اہم ہیں۔ تاریخ کی روشنی میں مسٹر کیمسن مسلمانوں کے لئے زیادہ قابل احترام نہیں تھے لیکن نذیر احمد سے ان کے تعلقات ذاتی نوعیت کے تھے وہ ان کی عنایتوں سے بہت متاثر تھے۔ اس کے برعکس مسٹر ریڈ نے نذیر احمد کو ایک زمانے میں کافی پریشان کیا تھا۔لیکن بعد میں ان دونوں کے تعلقات درست ہو گئے تھے۔ ریڈ صاحب کی ناراضگی کا

سبب بھی کچھ عملے تھے جو نذیر احمد سے ذاتی بغض وعنار رکھتے تھے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نذیر احمد نے اس ناول میں اپنی نجی زندگی کے اہم تجربات بھی پیش کیے ہیں۔سب سے اہم بات کہ ابن الوقت اور حجتہ الاسلام اور نذیر احمد تینوں بھی ڈپٹی کلکٹر تھے۔اس طرح یہ کردار ان کی شخصیت کے دو پہلو کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اس ناول کو پڑھنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نذیر احمد کا ذہن اس زمانے کے تمام سیاسی، مذہبی، اقتصادی، معاشرتی، سماجی واقعات سے آگاہ تھا۔ان کے تمام کردار انھیں حقائق کے پس منظر میں ابھرتے ہیں اس میں اس وقت کی پوری ہندوستانی تہذیب کے خاص خاص خط وخال نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں یہی نہیں اس میں مسلمانوں کی کوتاہیوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کی عیاریاں اور انکی فرنگی ذہنیت بھی سامنے آتی ہے۔اس ناول میں موثر انداز میں غدر کے حالات اور اس وقت کی دلی کی تباہی کا نقشہ عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اس کے بعد غدر کے ردعمل کے طور پر جو حالات رونماں ہوئے ہیں ان کا بھی عکس اس میں دیکھنے کو ملتا ہے ابن الوقت ایک ایسی علامت ہے جس میں اس دور کی پوری تہذیب کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔اس میں نذیر احمد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے متوسط طبقے کی اندرونی معاشرت کی ایسی بے لاگ تصویر کھینچی ہے کہ آنکھوں کے سامنے پورا منظر گھوم جاتا ہے اور یہ ناول اس عہد کا ایک استعارہ بن جاتا ہے۔ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نذیر احمد کی تصنیف تاریخی اعتبار سے بھی

ایک دستاویز بن گئی ہے جو نذیر احمد کی فکر و بصیرت کا ایک اچھا اور اعلیٰ نمونہ ہے۔اس کا پلاٹ معنویت سے بھر پور ہے اس کے کردار اس دور کے خوبصورت مرقعوں سے آراستہ ہیں۔اس ناول میں نفسیات انسانی کا گہرا مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور علامتی انداز میں مغربی تہذیب کو پھیلتا ہوا دکھایا گیا ہے۔اس ناول میں قومی تہذیب کے اہم مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے۔جو حیات انسانی کا نہایت اہم موضوع ہے۔غرض کہ ابن الوقت میں سرسید کے زمانے کے ان تمام حالات کی عکاسی ملتی ہے۔جو سرسید کی تعلیمات کے بعد پیدا ہوئے تھے۔اور متوسط طبقے کی جہد البقا کی عکاسی کرتے ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ناول نذیر احمد کی سب سے عمدہ تصنیف ہے جو انھیں ناول نگاری کے باب میں زندہ رکھے گی۔

ایامیٰ

ایامیٰ نذیر احمد کا چھٹا ناول ہے۔ اس ناول کو زیادہ شہرت نہیں ملی ۔ اس میں ایک بیوہ کی الم ناک داستان بیان کی ہے۔ ناول کا عنوان ایامیٰ دراصل عربی زبان کا لفظ کے معنی بیوہ کے لیے ہیں ۔ بیوہ کے دکھ درد کی صورت حال جو اس زمانے میں تھی اسے نذیر احمد گہرائی اور گیرائی سے ناپ تول لیا تھا۔ یہ مسئلہ بے حد سنگین تھا اور آج بھی بڑی حد تک سنگین سمجھا جاتا ہے ۔ نذیر احمد کے عہد میں ایک بیوہ کی کیا اوقات تھی اس کی بہترین عکاسی نذیر احمد نے اس ناول میں کی ۔ ایک بیوہ زندہ لاش تھی اس کے لئے سجنا سنورنا ، اچھا لباس پہننا، شادی بیاہ کی رسوم میں شرکت کرنا معیوب اور بدشگون سمجھا جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ بعض اوقات تو شوہر کی موت کا ذمہ دار بھی اسی کو سمجھا جاتا تھا۔ شوہر کے نہ ہونے سے بعض احباب تو بیوہ کا طرح طرح سے استحصال کیا کرتے تھے۔ وہ نامراد بے سہارا یہ سب کچھ چپ چاپ سہتی تھی زمانے کا یہی رواج تھا بیوہ ہونا اس کا سب سے بڑا جرم تھا۔ اس ناول میں نذیر احمد اس بات کو ناول کی ایک کردار آزادی بیگم کی زبانی یو

بیان کیا :

''جن کے مرد پاس نہیں ان کا تو بھلا کیا مذکور ہے۔جن کے مرد پردیس میں ہوتے ہیں کیا وہ سر نہیں دھوتیں، کپڑے نہیں بدلتیں، پھول، چوڑیاں نہیں پہنتی، مہندی نہیں لگاتیں، بناؤ سنگار نہیں کرتیں، میں نے ذرا کی ذرا آئینے میں منہ کیا دیکھا کہ لگی چاروں طرف سے بھر مار ہونے۔ان زبردستی کی بدگمانیوں کی روک تھام مجھ سے نہ ہوا اور نہ آئندہ ہوگا۔لوگ ایک بدگمانی نہیں لاکھ بدگمانیاں کریں بلا سے۔مردوں نے یہ کیا آفت برپا کر رکھی ہے۔ناحق بیٹھے بیٹھائے کسی کو رسوا کرنا اچھی بات ہے۔؟ شادیاں بھی ہوتی ہیں، نکاح بھی ہوتے ہیں مگر یہ طریقہ کہیں سننے میں نہیں آیا اور کسی کی پناہ پکڑے بغیر یہ فضیحتا بند ہوتا نظر نہیں آتا۔اگر میں واقعی خوبصورت ہوں جیسا کہ لوگ خیال کرتے ہیں تو خوبصورتی کچھ رنڈاپے سے نہیں آتی مگر لوگ جانتے تھے کہ ایک نکاح میں ہی اس سے کسی کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا اب دیکھا کہ کوئی اس کا سرپرست نہیں، لگے عاشق کا دم بھرنے۔''[1]

نذیر احمد نے اس ناول میں تلخ حقیقت نگاری سے کام کیا انہوں نے آزادی بیگم کی بیوگی کے حالات کی بہترین عکاسی کی کہ مطالعہ کرنے والے کو حقیقی قصے کا گمان ہوتا ہے بعض لوگوں نے تو آزادی بیگم میں نذیر احمد کی بیوہ سالی کا عکس بھی اس میں تلاش کر لیا۔بہرحال یہ ناول آزادی بیگم کی تلخ زندگی کا حقیقی مرقع معلوم ہوتا ہے۔نذیر

[1] ابن الوقت، مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد، فرید بک ڈپو، دہلی ۲۰۰۵، صفحہ ۲۴۴

احمد نے اس ناول میں عورت کے احساس ونفسیات کو سچے پیرائے میں بیان کرنے کی بھر پور کوشش کی نذیر احمد نے بیوہ کی زندگی کے سب سے اہم مسئلے کو بڑی دیانت داری اور خوبی سے بیان کیا۔ وہ مسئلہ ہے جنس کا۔ انہوں نے اس نکتے کو شدت سے محسوس کیا اور اس بات پر زور دیا کہ شوہر کے انتقال کے ساتھ بیوی کی ضروریات کا بھی انتقال نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں ملاخطہ فرمائیں یہ بیان :

''ان بیچاریوں کے شوہر فوت ہوئے تھے نہ کہ ضرورت جس کی وجہ سے دنیا جہاں میں نکاح ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے خود ان کے پہلے نکاح ہوئے تھے۔''[1]

نذیر احمد کے عہد میں نسائی خواہشات اور اس کے انسلاکات کا ذکر کرنا بھی ممنوع تھا لیکن نذیر احمد نے اس سلسلے میں ہمت سے کام کیا۔ جب آزادی بیگم کو ایک غیر مرد کی آواز سن کر کشش محسوس ہوتی ہے تو نذیر احمد بڑے سلیقے سے اس کے احساسات کی یوں عکاسی کرتے ہیں :

''جسم پر میرا بس چلتا تھا اور اس کی میں نے حفاظت کی لیکن دل تو میرے اختیار میں نہ تھا۔ وسوسوں کو کیونکر روکتی، خیالات کو کس طرح ٹالتی، پس میرا بدن بالکل بے گناہ ہے لیکن دل، میں نہ اس کو گناہ سمجھتی ہوں اور نہ بے گناہ کہتی ہوں۔ مجھ پر ایک وقت گزرا ہے، دن نہیں، ہفتے نہیں، مہینے نہیں بلکہ برس کہ مرد کی آواز میرے کانوں کو

[1] ایامی، ڈپٹی نذیر احمد، سن ندارد، صفحہ ۱۷۲۔۱۷۳

بھی بھلی معلوم ہوتی ہے رات کو چوکیدار پکارتا یا دن میں سودے والے صدا لگاتے تو میں کان لگا کر سنتی بلکہ ایک دفعہ تو بے اختیار ہو کر ڈیوڑھی میں جا کر کھڑی ہوئی اور پھر مہینوں اپنے تئیں ملامت کرتی رہی ۔ ۔ ۔ بیوہ ہو کر بیوگی کی قدر جانی کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں ۔'' [۱]

نذیر احمد نے اس ناول میں ہندوستانی تہذیبوں کے اختلات کے اثرات کو بھی کھل کر بیان کیا ہندو مسلم رسومات کے ایک دوسرے پر جزوی طور اثرات کو بھی بیان کیا قدیم زمانے میں ہندوؤں میں 'ستی' کی رسم کا رواج تھا۔عورت کو مرد کے انتقال کے بعد جینے کا حق نہیں تھا اسے زندہ جلایا جاتا تھا۔لیکن انگریزی سرکار نے اس پر مکمل پابندی لگا دی ۔ پھر بھی ایک بیوہ پر سماج میں طرح طرح کی آرائش کو حرام قرار دیا جاتا تھا آج بھی بیوہ کی آرائش کو پسند نہیں کیا جاتا ہے۔اس کے اثرات مسلم معاشرے پر بھی پڑے وہ مسلمان جو مذہبی معلومات سے بے خبر تھے انہیں اس بات کا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اسلام میں عورت کے عقد ثانی کے لئے صاف صاف ہدایات موجود ہیں ۔ اس بات کا ایک جگہ ناول میں یوں ذکر کیا گیا :

''عرب، شام و روم ، افریقہ ، فارس کہیں کے مسلمان بیوہ کے دو نکاح میں کسی طرح کی عار نہیں سمجھتے ۔ یہ خاص کر کچھ ہندوستان ہی میں مسلمان کی شامت ہے'' [۲]

اس ناول کا موضوع ہے بیواؤں کا عقد ثانی ۔ ہندوستان میں بیوہ عورتوں کے

[۱] ایامی، ڈپٹی نذیر احمد، صفحہ ۲۲۰

[۱] ایامی، ڈپٹی نذیر احمد، صفحہ ۲۲۱

کے ساتھ جو ناروا سلوک ہوتا رہا ہے۔ نذیر احمد نے اس کے خلاف اس سے پہلے بھی آواز بلند کی تھی۔ آزادی بیگم جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی۔ اس نے بیوگی کا درد سہا تھا۔ اس لیے وہ خود کو بیواوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ وہ لوگوں کو اس موضوع کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتی ہے اور مرنے سے قبل ان کی دردناک حالت پر تقریر کرتی ہے۔
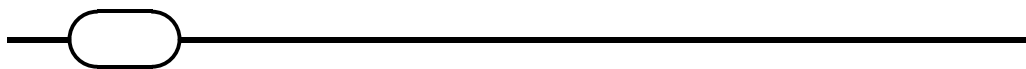
رویائے صادقہ

رویائے صادقہ نذیر احمد کا آخری ناول ہے۔ اس کی اشاعت ۱۸۹۴ء میں ہوئی۔ اس ناول کا مرکزی کردار صادقہ ہے جو بچپن سے جو بھی خواب دیکھتی ہے وہ سچ ثابت ہوتے ہیں اس وجہ سے مشہور ہو جاتا ہے کہ اس پر جن یا بھوت کا اثر ہوا ہے۔ اس لئے کوئی گھرانا اسے بہو کے شکل میں اپنانے کو تیار نہیں ہوتا۔ آخر کار علی گڑھ کا ایک طالب علم صادق، صادقہ کا ہاتھ مانگتا ہے اور اس کے والد کو ایک مفصل خط لکھتا ہے۔ اس خط میں وہ اپنے مذہبی عقائد بیان کرتا ہے۔ دراصل جدید تعلیم نے اس کے مذہبی عقائد کو ڈانو ڈول کر دیا ہے لڑکی کے والدین کو یہ رشتہ منظور کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ لیکن صادقہ اپنی سہیلی کے ذریعے یہ کہتی ہے کہ یہ رشتہ ہو کر رہے گا کیونکہ مرا خواب یہی کہتا ہے اور آخر کار صادقہ کی شادی اسی لڑکے سے ہو جاتی ہے۔ صادقہ خواب دیکھتی ہے کہ کوئی بزرگ صادق کی الجھنوں کو سلجھا رہے ہیں اور دلیلوں سے اس کے شکوک وشبہات دور کر رہے ہیں۔ یہ بزرگ دراصل سرسید ہیں جنھوں نے مذہب اسلام کو مطابق عقل ثابت

کرنے کی کوشش کی ۔ صادقہ اپنے شوہر کو ان بزرگ کی ساری تقریر بیان کرتی ہے ۔ بزرگ کی تقریر یقیناً سرسید کے مدلل مذہبی افکار ہیں ۔ یہ افکار صادق کے شکوک وشبہات کو رفع کر دیتے ہیں ۔

نذیر احمد کا فن:

نذیر احمد کے یہاں فکر وفن کا ایک منضبط نظام ملتا ہے ۔ اس سے واقفیت کے لئے ہمیں نذیر احمد کے نظریہء کائنات کو سمجھنا پڑیگا جو ان کے مختلف ناولوں میں بکھرا نظر آتا ہے ۔ رویائے صادقہ میں بھی اس کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے ۔ ملاحظہ فرمائیں یہ اقتباس :

''بات یہ ہے کہ انسان اس طرح کا مخلوق ضعیف ہے کہ وہ متاثر ہوتا ہے تعلیم سے ، تربیت سے ، صحبت سے ، سوسائٹی سے ، رسم ورواج سے ، آب وہوا سے ، مزاج شخصی سے ، اپنی خواہشوں سے ، اپنی ضرورتوں سے اور کوئی جان نہیں سکتا کہ یہ سب باتیں جمع ہو کر کیا نتیجہ پیدا کریں گی'' ۔ [1]

سماجی ماحولیت کا یہ تصور ہی نذیر احمد کی کردار نگاری کی کلید ہے یہی ان کے کرداروں کے اعمال وافعال کے کھرے کھوٹے اور غلط صحیح کی شناخت کی کسوٹی ہے ۔ نذیر احمد اپنے کردار کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی سوانح عمری کا مختصر خاکہ بھی بیان

[1] ایامی، ڈپٹی نذیر احمد، صفحہ ۲۲۶

کرتے ہیں جو بطور خاص ان کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہوتا تھا اور اس میں معنی خیز اشارے ہوتے تھے۔ انہوں نے صادق کے کردار کو اسی طریقے سے تراشا ہے۔ اس کی ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے :

''نیچری ابن الوقت ہیں یعنی اس زمانے کی پیداوار'' [1]

رویائے صادقہ میں نذیر احمد کا فن بلندی پر نظر آتا ہے۔ نذیر احمد کا تصور کائنات بھی اس میں کہیں کہیں نظر آتا ہے۔

کردار :

رویائے صادقہ میں صادقہ کے کردار میں ایک ایسی وجدانی صلاحیت کی موجودگی دکھائی گئی ہے جو خواب کے وسیلے سے خرق عادت تک کی منزل تک پہنچ جاتی ہے مگر اس ناول کے آغاز میں بھی راوی کے متکلم ہونے کے باوجود بیانیہ اپنا جو انداز اختیار کرتا ہے اس کو معروضی اسلوب کے کامیاب نمونے کہا جا سکتا ہے۔ اس ناول کی ابتدا میں صادقہ کا تعارف یوں پیش کیا گیا :

''ہم مدت تک اسی خیال میں رہے کہ صادقہ اور یوشفی دو سگی بہنیں تھیں اب تحقیق ہوا کہ ایک ہی عورت کے دو نام ہیں اور اصلی ایک بھی نہیں۔ اس کو میکے ہی میں لوگ صادقہ کہنے لگے تھے اس واسطے کہ اس نے ساری عمر نہ کبھی جھوٹا خواب دیکھا اور نہ اپنے

[1] رویائے صادقہ، ڈپٹی نذیر احمد، صفحہ ۲۰۲

جی سے بنا کر کوئی خواب بیان کیا۔ بیاہی گئی تو سسرال کی طرف سے یوسفی خطاب ملا۔''[1]

نذیر احمد نے رویائے صادقہ کے دیباچے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے جو ان کے مطمع نظر کو روشنی میں لاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں :

''تمہید کے طور پر جو کہنا منظور رہے یہ ہے کہ آدمی کے ساتھ ساتھ مذہب اور مذہب کے ساتھ ساتھ اختلاف پیدا ہوا اور اس اختلاف کو بھی چین سے نہ رہنے دیا۔ ان دنوں مذہبی چرچے بڑے زوروں پر ہیں اور اس کے ضروری نتیجے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اس رسالے کی تصنیف کرنے سے غرض یہ ہے کہ مسلمان جہادی بلکہ اجتہادی مسلمان ہوں اور آپ بھی امن چین سے بیٹھیں اور دوسروں کو بھی امن چین سے بیٹھے رہنے دیں۔''[2]

غرض رویائے صادقہ نذیر احمد کا کامیاب ناول ہے اس میں بھی ان کے فن کی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس میں بھی اصلاحی نظریہ صاف صاف نظر آتا ہے۔ لیکن فنی اعتبار سے ان کے نظریہ کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو نذیر احمد ایک کامیاب ناول نگار کہے جا سکتے ہیں۔

نذیر احمد کے تمام ناولوں کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد کے رجحانات اور تصورات وہی ہیں جو سرسید کے رفقاء کے مخصوص افکار

[1] رویائے صادقہ، ڈپٹی نذیر احمد، صفحہ ۲۷۷

[2] رویائے صادقہ، مجموعے ڈپٹی نذیر احمد، صفحہ ۹۵۴

سمجھے جاتے ہیں۔ نذیر احمد کی ناول نگاری کا محرک قومی اصلاح کا جذبہ تھا۔ اُن کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مجلسی زندگی کا ایک مثالی مگر معقول نمونہ قوم کے سامنے پیش کیا۔ نذیر احمد کی خاص خدمت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی مثالی مگر معقول صلاحیتوں کو گھروں کی آبادی اور خانگی زندگی میں خوشحالی اور مسرت پیدا کرنے لئے استعمال کیا اور یہ اس معنی میں بہت بڑا کارنامہ ہے کہ خانگی مسرت قومی ترقی میں بہت بڑی حدتک مدو معاون ہوسکتی ہے۔ اس غرض کے لئے انہوں نے عورتوں کو منزل زندگی کا سنگ ِ بنیاد قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر مظفر عباس ان کی ناول نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ان کے فن کی بنیاد مقصدیت پر قائم ہے جس کی مختلف سطحیں فرد سے معاشرے کی طرف سفر کرتی ہیں۔ ان کا مطمع نظر قومی اخلاقیات کی اصلاح ہے اور اس طرح ان کے ناولوں کا رشتہ سرسید کی اصلاحی تحریک سے جوڑا جاسکتا ہے۔''[1]

نذیر احمد کے ناول زیادہ تر اصلاحی ہیں وہ مشرقیت کے دلدادہ اور مغربیت کے مخالف ہیں ان کی یہ نفسیات ان کے تمام ناولوں میں جاری وساری ہے۔ ان کے ناولوں کے پلاٹ مربوط اور مستحکم ہیں ان میں فکری وفنی ارتقاء پایا جاتا ہے۔ ان کے ناولوں کے کرداروں کی شخصیت میں مثالیت کے بجائے حقیقت کا غلبہ نظر آتا ہے۔ اپنے افادی پہلو، واقعہ نگاری، منظر، طنز ومزاح اور فن اور زندگی کے رشتے کو استحکام بخشنے کے اعتبار سے نذیر احمد کے ناول خصوصی اہمیت کے حامل بن گئے ہیں۔

[1] مظفر عباس، اردو ناول کا سفر، گوہر پبلیکیشنز، لاہور، صفحہ ۴۷۔۵۷ سن ندارد۔

نذیر احمد کی ناول نگاری کے تعلق ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو ادب میں مولوی نذیر احمد کا نام ان کے ناولوں سے زندہ رہے گا اور لوگ تعجب کیا کریں گے کہ کس طرح ایک عربی، فارسی کا عالم مولوی قسم کا آدمی بھی ایسے ناول لکھ گیا ہے جو گفتگو، کردار سماج کی حالت بیان کرنے میں اس قدر کامیاب ہیں شائد ان سے بہتر کوئی ناول نگار نہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد کے تمام ناول کسی نہ کسی طرح اردو زبان و ادب کے اولین نقوش کہے جا سکتے ہیں۔ نذیر احمد کے ناولوں سے قبل از دور میں باضابطہ نگاری کی کوئی روایت نہیں ملتی ہاں داستانوں کی ایک طویل تاریخ ضرور ملتی ہے اس لئے نذیر احمد کے سامنے کوئی ایسا ناول اردو میں نہیں تھا جس کے فنی لوازم اور اصول وضوابط کے مدنظر ناول لکھی جاتی۔ نذیر احمد کے زمانے میں خاص طور سے ۱۸۵۷ء کے بعد ایک زوال پذیر معاشرے میں خود اعتماری پیدا کرنا اور تہذیب وتمدن کے عناصر کو پھر سے کھڑا کرنا ایک اہم مسئلہ ضرور تھا مسلمانوں کے سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو سامنے رکھ کر قِصّہ گوئی کی نئی روایت قائم کرنا ایک چیلینج سے کم نہیں تھا جو حقیقت نگاری زندہ مثال ہو۔

چنانچہ نذیر احمد نے مسلم معاشرے میں عورتوں کی تعلیم اور ان میں اصلاحی حمیت کو جگانے کا بیڑا اٹھایا اور سات ناول لکھے جو کسی نہ کسی مسئلہ پر منحصر ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں کو ہم انگیریزی ناول نگاری کے فن پر پرکھنا چاہے تو بھلے ہی پورے نہیں اترتے

لیکن ان میں قصہ پن کردانہ مکالمہ اور موضوع جیسے فنی عناصر آسانی سے تلاش کیئے جاسکتے ہیں مذکورہ ناولوں کے تنقیدی مطالعہ کے بعد یہی نتیجہ نکل کر سامنے آتا ہے جو اپنے آپ میں ایک قابل قدر کارنامہ ہے اور ناول نگاری کے مشعل راہ بھی ہے۔

باب چہارم

ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں کا سماجی مطالعہ

۱؎ آزادی سے قبل اردو نظم کا سماجیاتی مطالعہ صفحہ ۱۹۸

۲؎ پرویز مجیب، تاریخ تمدن ہند صفحہ ۸

ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں کا سماجی مطالعہ:

کہا جاتا ہے کہ انسان سماجی جانور ہے یہ بھی سچ ہے کہ آج بھی اس کی معنویت اہمیت وافادیت سے مسلم ہے کیونکہ انسان کو سماج ہی میں زندگی گزارنا پڑتا ہے ۔فرد کی اپنی سوچ اور فکر، احساسات، جذبات، نظریات سبھی کچھ سماج میں ہی پروان چڑھتے ہیں سماج سے الگ ہوکر کوئی فرد تنہا زندگی نہیں گزار سکتا یہ کہنا کوئی غلط نہیں ہوگا۔ یہ بھی بات صحیح ہے۔

بقول ممتاز جہاں صدیقی ''آدمی سے انسان بننے کا سفر وہ سماج ہی میں طئے کرتا ہے انسان کی زندگی اور اس کے وجود کی بقاء سب کچھ سماج ہی کی مرہون منت ہے۔'' [۱]

سماج اپنے آپ میں ایک ایسا ادارہ ہے جو افراد سماج سے متاثر بھی ہوتا ہے اور افراد پر اثر انداز بھی۔ بقول پروفیسر مجیب ''افراد کی ذہنی نشونما سماج میں رہ کر ہی پروان چڑھتی ہے شاعر یا ادیب بھی اپنے سماج کا ہی پرودہ ہوتا ہے۔کوئی بھی ادب سماج سے الگ رہ کر تخلیق نہیں ہوتا، ادب اور معاشرے کے درمیان گہرا رشتہ ہوتا ہے۔'' [۲]

اس لئے کہا جاتا ہے کہ ادب سے معاشرے اور ثقافت کے عناصر کی ترتیب بھی ہوتی ہے اور سماج کی صحیح سمت و رفتار بھی مقرر کی جاسکتی ہے۔

ادیب یا شاعر جو کچھ سونچتا ہے اور اپنے دائرے فکر میں جو خاکہ بناتا ہے وہ در اصل سماج یا معاشرے کی عکاسی ہی کرتا ہے۔یعنی یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سماج اور

معاشرے کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے اس لئے ادب کے مطالعے میں سماج کے ادبی و ثقافتی عناصر کا کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے ۔اس لئے ادب کے مطالعہ میں سماج کے ادبی و ثقافتی عناصر کا علم لازمی ہے ۔کوئی بھی ادیب اپنے دور کے سماجی مسائل، سیاسی حالات اور معاشرتی طرز زندگی سے لاتعلق نہیں ہوسکتا ۔اور ناول نگاری میں بھی اس طرح عمل یقینی طور پر پایا جانا فطری عمل ہے ۔ڈپٹی نذیر احمد کا دور دراصل ۱۸۵۷ء کا دور ہے اور ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی، سماجی اور معاشی ومعاشرتی حالات کا عکس ہمیں نذیر احمد کے ناولوں میں بہ آسانی نظر آتا ہے ۔

سماج اور معاشرے میں تبدیلی، انقلاب یا تغیر ناگزیر ہے کیونکہ تغیر اور تبدیلی اور فطری عمل اور مسلسل جاری رہنے والا عمل ہے ۔ ہر دور اور ہر عہد میں سماج اور سماجی اقدار اور معاشرے کی نوعیت تبدیل ہوتی رہی ہے اور اس کی وجہ سے سماج میں کئی طرح کے مسائل بھی پیدا ہوتے رہے ہیں ۔ کچھ مسائل دب کر رہ جاتے ہیں یا حالات کے تحت پس حیثیت ڈال دئے جاتے ہیں اور کچھ نئے مسائل سر اٹھائے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں ان نئے مسائل سے انسان خاص طور سے ادیب اور مفکرین نیا ذہن، نئی سوچ کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور مسائل کا حل تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں ۔

زمانے کے بدلتے ہوئے رجحان، سیاسی انقلابات کی وجہ سے بے شمار تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ۔اقتدار کی منتقلی شکست اور شکست خوردہ قوم یا حکمراں وقت اقتدار کی منتقلی

تک محروم نہیں ہوتے ہیں بلکہ محکوم قوم اپنے تہذیبی ورثہ فکری اہمیت لسانی اور معاشرتی طرز زندگی سے بھی محروم ہو جاتی ہے اور احساس کمتری کا شکار ہو کر غلامانہ ذہنیت اپنانے پر مجبور و مایوس ہو کر زندگی گذارتی ہیں۔

۱۸۵۷ء غدر کی وجہ سے حاکم قوم محکوم بن گئی اور ہندوستان پر انگریزوں کے اقتدار کا آغاز ہوا جس کی وجہ سے ہندوستانی معاشرے میں خاص طور سے مسلم سماج میں کئی مسائل ابھر کر سامنے آئے اس ملک کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مفتوح اور فاتح قوم کے درمیان کشیدگی پیدا ہوتی رہی ان میں کبھی تصادم بھی ہوا اور کبھی مفتوح قوم نے لچکدار رویہ بھی اپنایا اور معاملہ فہمی کے ذریعہ سماجی طبقے نے نئے حالات سے صلح کر کے درمیانی راستہ نکالنے کی کوشش بھی کی۔

سیاسی انقلاب کے علاوہ قدرتی آفات بھی سماجی، معاشرتی، ثقافتی مسائل کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مثلاً: سیلاب، خشک سالی، آتش زنی اور وبائی امراض وغیرہ۔سماج و معاشرے کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کے آغاز اور ہندوستانی حکمرانوں کی شکست سے ایسے ہی کئی مسائل سماجی سطح پر ابھر کر سامنے آئے، فاتح اور مفتوح قوم کے درمیان کشیدگی پیدا ہوتی گئی اور ان میں تصادم بھی ہوا۔مفتوح قوم نے فاتح قوم کے خیالات عادات واطوار اور ذہنی فکر سے معاملہ فہمی اور سنجیدگی اختیار کی جس وجہ سے ایسے حالات میں انسانیت، ہمدردی اور اپنائیت کے جذبات بھی

پروان چڑھے اور تہذیبی وتمدنی یگانگت کوفروغ حاصل ہوا۔

خانگی زندگی سے اجتماعی زندگی تک روزمرہ کے مسائل سماجی مسائل کے دائرے میں آگئے ۔غربت افلاس ، باہمی کشیدگی ، اجتماعی وانفرادی زندگی میں بے راہ روی ، ذات پات اورنسلی تفریق ،عورتوں کے مسائل وغیرہ اوراس وقت تک انھوں نے پیچھا نہ چھوڑا جب تک کہ اس کا حل تلاش نہ کیا جائے ۔ بقول ڈاکٹرشکیل احمد،

''نئے حالات وحادثات میں نئے مطالبات بھی تھے جن سے سب کا سابقہ بھی تھا جن سے سب کونبردآزما ہونا پڑا تھا۔سماجی اورمعاشرتی مسائل یہیں سے پیدا ہوگئے اور یہیں سے ان کے فوری حل کی کوشش کی جاتی ہے۔[۱]

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستان میں انگریزوں کی عمل داری شروع ہوئی مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوااورخاص طور سے مسلمانوں کی بےچینی وبےاطمینانی میں اضافہ ہوا تو کچھ قوموں نے اس صورت حال کو بدلنے کے لئے تعلیم کواہمیت دی ،اس سلسلے میں سرسید احمد خان اوران کے رفقاء جن میں نذیراحمد بھی شامل ہے ان کا بڑا اہم رول رہا۔

نظیراحمد کا عہداورسیاسی ،سماجی اورمعاشی حالات:

ڈپٹی نذیراحمد نے جس عہد میں زندگی گزاری اس کا تاریخی تہذیبی پس منظرکو سمجھے بنا ہم ان کے ناولوں کا سماجیاتی نقطہ نظر سے مطالعہ نہیں کرسکتے ۔اس لئے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ مذکورہ باتوں پرغورکیا جائے ۔

۱: شکیل احمد، اردوافسانوں کا سماجیاتی مطالعہ۔صفحہ۸۹

مسلمانوں کا زوال:

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ ہندوستان پر مسلمانوں نے تقریبا آٹھ سو(۸۰۰) برس تک حکومت کی ۔اوراس ملک کو باعزت و باوقار بنایا۔وہ اس ملک میں اجنبی بن کر نہیں رہے بلکہ انھوں نے اپنی ذہانت،علم وفن اورحکمرانی کے ذریعے ایک اعلیٰ تہذیب و تمدن کی وجہ سے ہندوستانی معاشرے میں معزز وممتاز بھی گردانے گئے ۔

مسلمانوں نے ہندوستانی معاشرے کواسے اعمال ،افکاراور انسانی جذبہ سے معمور کیا۔قدیم ہندوستانی معاشرے کی برائیوں کو جیسے ذات پات، چھوت چھات، دختر کشی اورستی کی رسم جیسے غیرمہذب طریقوں کو بند کرنے کی کوششیں کیں۔لیکن پوری طرح ختم نہیں کر پائے ۔زمانے تک مسلمان حکمرانوں نے اوران کے امراء نے تمدنی کارنامے انجام دئے۔

ایک زمانے تک مسلمان حکمرانوں نے اوران کے امراء نے تمدنی کارنامے انجام دئے ۔لیکن ہر چیز کوزوال بھی ہے۔جب اقتدار کا نشہ سر چڑھ کر بولنے لگتا ہےتو معاشرے میں خرابیاں بھی پیدا ہونےلگتی ہیں ۔مسلم معاشرہ بھی اس سے مبرّا نہیں اس معاشرے میں بھی خرابیاں پیدا ہوئیں ۔ یہاں تک کہ حکومت سے محرومی اورانگریزوں کی خلافت نے انھیں بالکل تباہ وبرباد کردیا۔اورمسلمانوں کا مستقبل تاریک نظرآنے لگا۔

مسلمانوں کی زندگی میں جونقائص پیدا ہو گئے تھے وہی ان کے زوال کا سبب بھی

بنے ۔ یہ اتنے عام ہو گئے تھے کہ مسلم معاشرہ ، اسلامی طرز زندگی ،شریعت اور اسلامی معاشرہ ہی نہ رہا ۔ یہ خرابیاں ہندوستان کے دیگر اقوام خاص طور سے ہندو معاشرتی نوعیت کی تھیں ۔جن کے اثرات مسلمانوں پر پڑے ۔ برسوں ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے ہندوں کے عقائد ونظریات ، رسم و رواج ،توہمات اورطرز معاشرت کے اثرات اس قدر گھل مل گئے کہ ہندوستانی معاشرہ اسلامی خصوصیات سے کوسوں دور چلا گیا۔اورزندگی کے اہم شعبہ جات پر غیر اسلامی اثرات غالب آ گئے ۔

انگریزوں کے دور میں ہندوقوم میں کئی نامور مصلح پیدا ہوئے ۔جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوں نے اپنے معاشرے کو درست کرنے پر توجہ دی ۔اوراس سے فائدہ بھی اٹھایا لیکن مسلمانوں میں اس نوعیت کی اصلاح پر دھیان نہیں دیا گیا۔ وہ زمانے کے تقاضوں سے غافل رہے ۔اوراپنی حالت بہتر بنانے پر کوئی توجہ نہ کی ۔جس کی وجہ سے بدلے ہوئے حالات نے مسلمانوں کو معاشرتی لحاظ سے بد سے بدتر بنا دیا۔اوریہی معاشرتی عیوب ان کیلئے نقصاندہ ثابت ہوئے ۔

مسلم معاشرے کی عام حالت:

نذیر احمد کے زمانے میں مسلم معاشرے کی جو عام حالت تھی وہ نہایت ہی پست اورطبقاتی حصوں میں بٹی ہوئی تھی ۔ دینی ،اخلاقی اورمعاشی اعتبار سے ان میں خرابیاں پیدا ہو چکی تھی ۔اسی لئے سر سیّد نے کہا تھا۔

''اس ملک میں ہماری قوم کی حال نہایت بدتر ہے۔اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہی ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی۔مشکل تو یہ ہے کہ قوم کی قوم جہل مرکب میں مبتلا ہے۔علوم جن کا رواج ہماری قوم میں تھا یا ہے اور جس کے تکبر وغرور سے ہر ایک پھولا ہوا ہے دین و دنیا دونوں میں بکار آمد نہیں۔'' [1]

مسلمانوں کے معزز خاندان غدر کے بعد تباہ و برباد ہو چکے تھے کچھ لوگ اس صدمے سے اس قدر دلبرداشتہ تھے کہ وہ اپنی شناخت بھی نہیں بچا پائے۔کئی لوگ صحیح طریقہ سے اپنے اجداد کے نام کا تلفظ بھی ادا نہیں کر پائے۔کئی امیروں اور شہزادوں کا یہ حال تھا کہ وہ بٹیر بازی اور کبوتر بازی میں مگن تھے۔نہ ان میں حکمرانی کی شان اور نہ ہی دبدبہ و وقار جنھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ نسل تیمور اور مغل خاندان کے چشم و چراغ رہے ہیں۔عام رعایا کا حال بھی اس سے الگ نہ تھا۔جوّا،شراب نوشی، رقص اور طوائفوں کے کوٹھوں پر گانے بجانے کے سوا یا پھر گلی کوچوں میں آوارہ گردی یا مٹر گشتی عام زندگی کا شیوا تھا۔یعنی معاشرہ طرح طرح کی برائیوں کا شکار ہو کر زوال پذیر ہو چلا تھا۔

عوام کی اقتصادی بدحالی:

اس زمانے میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت بھی نہایت خستہ تھی یہاں تک کہ عید اور تہوار منانے کیلئے بھی پیسے نہ تھے۔بقول سرسیّد ''عیدگاہ میں میں نے ہزاروں پر نظر ڈالی کسی کے گلے میں بحز گزی اور ادھوترا کے اور کچھ نہیں دیکھا کپڑے تو سب دھوئے

[1]: سرسیّد اور اصلاح معاشرہ۔صفحہ ۱۴

ہوئے اور اجلے تھے مگر ہزاروں آدمیوں کے انگرکھوں میں پیوند لگے تھے۔ [1]

عید کے دن کا یہ حال تھا تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عام دنوں میں مسلمانوں پر کس طرح کی آفت آن پڑی ہوگی۔ حاکم قوم محکوم اور غلام ہوچکی تھی۔ چند کوڑیوں کے مول محنت مزدوری سے گزارہ کررہی تھی نہ کوئی اپنا نہ کوئی پرسانہ حال سب ایک دوسرے کی طرح حسرت یاس اور امید لگائے زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ اپنی معاشرتی زندگی میں لوگ بدحال، مجبور اور بے بس نظر آتے تھے۔ ہر ایک شخص فکر معاش میں مبتلا تھا، بھیک مانگنے والوں کی بہتات تھی، جو لوگ کسی کے ہاں نوکر تھے انھیں بھی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ انھیں تنخواہیں بھی وقت پر نہیں دی جاتی تھی۔

۱۸۵۷ء کی ناکامی نے مسلمانوں پر بے انتہا مظالم سہنے پر مجبور کردیا تھا۔ بڑی بڑی حویلیوں کے مالک بھکاری بن گئے تھے اپنے ہی شہر میں انھیں ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اگر اس عہد کے معاشرے پر نظر ڈالی جائے تو نوابین اور جاگیرداروں کا ایک طبقہ تھا جن کی جائیدادیں چھن گئیں تھیں۔ دوسرا وہ طبقہ تھا جو اپنی جاگیراداروں کے رحم وکرم پر زندہ تھا اور اب دانے دانے کو محتاج تھا۔ تیسرا طبقہ وہ تھا جو پہلے سے ہی چھوٹی موٹی خدمات انجام دے کر اپنا گزارہ کرتا تھا۔ نوابیت چھن جانے سے مسلم معاشرے کے تمام طبقات متاثر ہوئے تھے اور ان کو اس سے نجات دلانے والا کوئی نہ تھا۔

[1] سرسیّد اور اصلاح معاشرہ۔ صفحہ ۱۸

امیروں کی خودنمائی:

عام مسلمانوں کا حال ٹھیک نہ تھا لیکن کچھ لوگ جو انگریزی کی خوشامد کرتے یا ان سے راہ رسم بڑھا کر اپنی دولت و جائیداد بچانے کی فکر میں لگے رہتے ان کی خودنمائی بھی اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ ایسے لوگ نام ونمود کی خاطر مذہب وقوم کی خدمت سمجھ کر جو روپیہ صرف کرتے تھے وہ بھی دراصل ضائع تھا خاص طور سے میمن برادری کا حال بہتر تھا وہ ثواب کے لئے لنگر خانہ کھولتے اور انھیں مسجدیں بنوانے کا شوق تھا۔ مسجد میں کوئی ملاّ رہتے تھے لنگر کا کھانا کھاتے اور پھر میمن برادری کے بچوں کو پڑھانے چلے جاتے۔ اس طرح کے تاجروں نے گو کہ اپنی دولت سے کچھ فلاحی کام کرنے کی بھرپور کوششیں کی لیکن وہ سب کچھ خودنمائی کا ذریعہ تھا اور ایسے لوگ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ہم سماج کے لئے کچھ فلاح و بہبود کا کام کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مسلمانوں کے امیر لوگ اپنی خودنمائی کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے تھے۔

خودنمائی کا یہ عالم تھا کہ امیر طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد ایک مسجد بناتے اس سے متصل ایک مدرسہ قائم کرتے تھے جس میں برائے نام طالب علم ہوتے لنگر خانے سے روٹی تقسیم کی جاتی دن میں ایک آدھ برائے نام سبق پڑھایا جاتا اور پھر مولوی کہیں نظر نہیں آتے۔ نہ تعلیم مکمل ہو پاتی نہ ہی طالب علموں کا مستقبل سنورتا بلکہ صرف نام نہاد

امیروں کے نام کے چرچے ہوتے کہ فلاں صاحب نے کتنا اچھا کام کیا۔ یہی خرابی عام تھی جس نے مسلم طبقہ کو تعلیم سے محروم ہونے میں مدد کی۔ بظاہر روپیہ پیسہ بھرپور خرچ ہوا لیکن حاصل کچھ نہیں صرف صاحب جائیداد اور امیر آدمی جس نے یہ کام کرنے کیلئے کچھ لوگوں کی مدد کی وہ اس آدمی کی خودنمائی کا چرچہ کرتا رہے۔ اور ان کی تقریب میں ہمیشہ رطب اللسان رہے۔

ماضی پرستی اور حال سے بے اعتنائی:

مسلمانوں کی ماضی پرستی نے ان کو حال اور مستقبل سے غافل بنا دیا تھا اور وہ اصلاح وترقی کے لئے کوکوششیں کرنے کے بجائے اس غلط فہمی میں زندگی گزار رہے تھے کہ وہ ترقی کی تمام منزلیں طئے کر کے اعلی درجہ تک پہنچ گئے ہیں اور اب ان کو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ تمام علوم وفنون اور زندگی کے ہر ایک شعبہ میں ان کے آباء واجداد نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اب مزید ترقی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس لئے وہ ہر نئی چیز سے گریز کرنے لگے اور ترقی پذیر زمانے کے ساتھ آگے بڑھنے کے بجائے لکیر کے فقیر بنے رہنے کو سب سے بڑی ترقی تصوّر کرنے لگے۔ اس طرح سوچ اور فکر نے مسلمانوں کو مزید دیگر مسائل سے دوچار ہونے پر مجبور کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی تحریروں کے ذریعہ خاص طور پر ناولوں میں یہ بات بتانے کی کوشش کی اس طرح کی سوچ دراصل قوم کے زوال کا سبب بنتی ہے۔ کی نئی بات کو حقارت کی نظر

اس کے فائدے سے محروم ہونے کے مترادف ہے۔لوگوں کے اعتراضوں کو سننے سے گریز کرنا اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنی غلطیوں کو درست کرنے کے بجائے اس سے بے اعتنائی برتنا۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں میں مذکورہ باتیں عام تھیں ان خرابیوں سے مسلمان انتہائی پستی کا شکار ہو چکے تھے اور اس کو مقدر کا لکھا سمجھ کر زندگی گزار رہے تھے۔قدامت پرستی نے مسلمانوں کو مزید زوال پذیر بنا دیا تھا۔وہ عمدہ اور اعلی اخلاق جو مذہب اسلام کی بدولت ہمیں ورثہ میں ملے تھے ہم اس سے کوسوں دور ہو چکے تھے اور صرف اپنے اجدار کے کارناموں پر فخر کرنا ایک شیواہ بن گیا تھا۔

تعلیم کی اصلاح:

معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے لئے تعلیم بے حد ضروری ہے ڈپٹی نذیر احمد کے زمانے میں معاشرے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوگئیں تھی۔اس کی بنیادی وجہ علم سے دوری اور جاہلت تھی۔جو لوگ تعلیم یافتہ تھے ان کی تعلیم و تربیت اس قدر ناقص تھی کہ نہ تو وہ معاشرے کے لئے مفید بن سکتے تھے اور نہ خود اپنی حالت درست کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے بلکہ ناقص معلومات کی بنا پر وہ معاشرے کے حق میں زیادہ نقصاندہ ثابت ہو رہے تھے۔تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ تر مذہبی لوگوں پر مشتمل تھا اور معاشرے کی اصلاح میں ہمیشہ یہی لوگ سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتے تھے۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی ایک اہم مسئلہ تھا انسان کو مذہب اور شائستہ بنانے کے لئے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کو بھی اہمیت دی جاتی ہے ۔کیونکہ اچھی تعلیم صرف چند کتابوں کے پڑھ لینے اور طوطے کی طرح یاد کر لینے اور امتحان دینے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے سب سے بڑی تعلیم دینے والی عمدہ سوسائٹی ہے ۔تربیت تعلیم کا بہت بڑا ارکن ہے ۔

جب تک تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی خیال نہ ہو اس بات کا امکان نہیں کہ ایک لڑکا انسان بن سکے گا ۔خاص طور سے ایسا لڑکا جو چند گھنٹے ماسٹر کے سامنے پڑھ کر آتا ہے ۔دراصل تربیت انسان کا ذریعہ ہے اور جب تک تعلیم و تربیت دونوں شامل نہ ہوں اولاد میں انسانیت نہیں آسکتی اور تربیت کا بہترین زمانہ لڑکپن کا زمانہ ہے کیونکہ اس زمانہ میں بچے میں ہر چیز کی تربیت کو قبول کرنے کی قدرتی صلاحیت ہوتی ہے ۔

نذیراحمد نے اپنے بچوں کی تربیت کی خاطر ہی کہانیاں لکھی اور اپنے بچوں کی ذہنی تربیت کو پروان چڑھایا جو اس زمانہ میں عام بات نہ تھی ۔

انگریزی تعلیم کا رواج:

ڈپٹی نذیراحمد کے عہد میں مسلمانوں کی سماجی حالت نہایت کسمپری کی تھی ۔مال و اسباب لٹ جانے کی وجہ سے لوگ صابر و شاکر انداز میں زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے تھے ایسے مایوسی کی حالت میں سرسیّد احمد خان انگریزی تعلیم حاصل کر کے اپنی

زندگی کو بہتر بنانے کی تلقین کر رہے تھے۔ان کا ماننا تھا کہ انگریزی تعلیم حاصل کر کے مسلمان سرکاری نوکری حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی مالی حالت کو خود کفیل بنا سکتے ہیں ۔اس سے کچھ حد تک مسلمانوں میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا رواج چل پڑا تھا۔انگریزی تعلیم کی اہمیت و افادیت ظاہر کرنے کیلئے سر سیّد جو استدلال پیش کرتے ہیں وہ کچھ اسطرح تھا۔

''جس زمانے میں جس قوم کی حکومت ہوتی ہے اس زمانے میں اس کی زبان اختیار کی جاتی ہے اور جن ملک میں جو زبان حکومت کی ہوتی ہے اس ملک میں اس زبان کا عروج ہوتا ہے اور لوگ اس کو اختیار کرتے ہیں خلفائے بنو اُمیّہ اور بنو عباس کے زمانے میں عربی زبان کا عروج تھا اور ہر شخص اس زبان کو سیکھنا چاہتا تھا۔ ہندوں کے زمانے میں ہندوستان میں سنسکرت کا عروج تھا اور لوگ اسی کو اختیار کرتے تھے ۔اور جب مسلمانوں کی عملداری ہندوستان میں ہوئی تو فارسی زبان کا عروج ہوا اور سب نے فارسی زبان میں تعلیم پانا اختیار کیا۔اور اب ہندوستان میں انگریز کی حکومت ہے جن کی زبان انگریزی ہے اور اسی زبان کو عروج ہے اس لئے ہر شخص اس زبان کے اختیار کرنے پر حائل ہے ۔لیکن مسلمانوں نے انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں بہت کوتاہی کی ہے جو بڑی غلطی ہے۔'' [1]

ڈپٹی نذیر احمد کا زمانہ دراصل سرسیّد کا زمانہ ہی ہے۔اس دور میں مسلمان

[1]: سرسیّد کے آخری مضامین۔صفحہ ۲۶

انگریزی زبان سے نفرت کرتے تھے مسلمانوں کا بڑا طبقہ انگریزی پڑھنے کو اسلام کے خلاف سمجھتا تھا۔

اصلاح معاشرہ اور نذیر احمد کی ناول نگاری:

مراۃ العُروس نذیر احمد کا پہلا ناول ہے یہ ناول باضابطہ کسی منصوبہ کے تحت نہیں لکھا گیا بلکہ وقفہ وقفہ سے انھوں نے واقعات قلمبند کئے۔انھوں نے اپنی اولاد کی تربیت کی خاطر سبق آموز واقعات کو بیان کیا اس زمانے میں تعلیمی نصاب نہایت خستہ تھا معاشرے کی اصلاح یا ایک طالب علم کو با اخلاق باکردار شہری بننے میں کوئی مدد نہیں کرتا تھا چنانچہ انھوں نے اسی مقصد کے تحت اپنے بچوں کو خود پڑھانے کا فیصلہ کیا اور خود ہی کتابیں ترتیب دینے لگے اپنی کتابوں میں 'مراۃ العُروس' بھی شامل ہے۔ جو اخلاق اور نصائح پر مشتمل ہے ساتھ ہی دلچسپ بھی۔

نذیر احمد کے تمام ناول اپنے زمانے کی مختلف سماجی حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں اور اپنے زمانے کے سماجی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں ان کا ایک بھی ناول ایسا نہیں جن میں ۱۹ویں صدی کی سماجی زندگی اور اس زمانے کے مسلم گھرانوں کی حقیقت کی ہو بہو تصویر نہ ہو۔سر سیّد احمد خان کی طرح نذیر احمد کا مقصد دراصل معاشرے کی اصلاح کرنا تھا ۔اس لئے انھوں نے اس دور کی حقیقی زندگی اور اس کے ٹھوس پہلوؤں کو ہمیشہ ہی اولیت دی۔اور سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے کے لئے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے

اصلاح کا مشورہ دیا کیونکہ۔

''تمام اچھے ناول کا مقصد انسان کو تبدیل کرنا اور انسان کے ذریعے سماج کو تبدیل کرنا ہے''۔[1]

درج ذیل بالا قول کے مطابق نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعے اس وقت کے معاشرے کو حقیقی روپ میں پیش کیا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول گھر گھر میں پڑھے جاتے ہیں۔

نذیر احمد کے ناول مراۃ العُروس ایک سبق آموز سماجی ناول ہے کیونکہ اس ناول میں نذیر احمد نے لڑکیوں کی تربیت اور ان کے مزاج کے مطابق زندگی کو خوشگوار اور ناگوار بنانے کا طریقہ بتایا ہے۔ انھوں نے پہلے اصغری کا قصّہ مکمل کیا جس میں ایک لڑکی اپنے عادات واطوار، صوم وصلواۃ اور نماز روزے کی پابند، امور خانہ داری میں ماہر تھی۔ ساتھ ہی خوش مزاج، عقلمند اور سلیقہ مند تھی۔ جس کی وجہ سے اس کی زندگی میں خوشیاں بکھری پڑی تھیں۔ اس نے اپنے حسن سلوک سے سسرال والوں کا دل جیت لیا تھا اور گھر کو جنت کا نمونہ بنا دیا تھا اور سب کی نظروں میں محترم بن گئی۔ اس طرح ایک مکمل ناول لڑکیوں کی تربیت اور امور خانہ داری سے متعلق تخلیق کی گئی دوسری بیٹی اکبری ہے لیکن یہ اپنی بہن سے متضاد عادات واطوار رکھتی ہے۔ ضدی، ہٹ دھرمی، لاڑ و پیار نے اسے حد درجہ خود غرض اور سنکی بنا دیا تھا۔ وہ اپنے مزاج کی وجہ سے اپنے گھر کو جہنم بنا دیتی ہے اور اس طرح نذیر احمد نے سماجی نکتہ نظر سے لڑکیوں کی تربیت کو اہم گردانتے ہوئے ناول کا موضوع

[1] دی ناول ٹوڈے۔ صفحہ ۱۵

بنایا۔

اس ناول کی خوبی یہ تھی کہ سب سے پہلے یہ ناول نذیر احمد کے لڑکیوں نے پڑھا، پھر پاس پڑوس کی عورتوں نے پڑھا جو نہ پڑھ سکتی تھی انھوں نے پڑھوا کر سنا۔ اونچے اونچے گھروں میں کتابیں منگوائی گئی لوگوں نے اس کی نقلیں تیار کرا کے اپنے رشتہ داروں میں بھجوائیں۔اس طرح سے ' مراۃ العُروس' اپنے دور کی مقبول ترین کتاب بن گئی۔

ڈپٹی نذیر احمد کا دوسرا ناول تعلیم ، اخلاق اور تربت خانہ داری کے اصلاح پر مبنی ہے۔اگر اسے مراۃ العُروس ناول کی توسیع کہی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔نذیر احمد کے عہد میں تعلیم نسواں کا کوئی خاطر خواہ نظام نہ تھا۔نذیر احمد تعلیم نسواں کو عام کرنے کے حق میں تھے اور جدید علوم کی تعلیم عورتوں میں عام کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ بنات النعش میں معاشرتی زندگی سے متعلق معلومات عامہ کے مختلف پہلوؤں کو نہایت آسان اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

انھوں نے اس ناول میں سائنسی مضامین کو نہایت ہی دل کش پیرائے میں بیان کیا ہے علم جرثیل زمین کی کشش ، ہوا کا دباو، کشش استقلال ،خوردبین ،رنگوں کی تبدیلی، تاریخ جغرافیہ،سمندر، بادل ، برسات ،بجلی ، روشنی ،اجزام فلکی وغیرہ سے متعلق معلومات قصے کے روپ میں پیش کر کے بچے بچیوں کو نئی تہذیب اور نئی حقیقی بنیادوں سے روشناس

کرایا ہے۔

'مراۃ العُروس' ناول کی طرح ہی اس ناول میں بھی تعلیم نسواں سے متعلق اہمیت وافادیت پر زور دیا گیا ہے۔ اصغری بیگم کے قائم کردہ مدرسے میں ہی بنات النعش کی ہیروئن تعلیم حاصل کرتی ہے اور باتوں باتوں میں اصغری بیگم سے مذکورہ تمام علوم سے متعلق معلومات حاصل کر لیتی ہے اور اپنے عام معلومات میں اضافہ کرتی ہے اور دین و دنیا کے تمام مضامین سے آگہی حاصل کر کے اپنے ذہن کو لبریز کر لیتی ہے۔ اس کی شخصیت پر کشش جاذب نظر اور دلکش بن جاتی ہے۔ اس طرح ایک نئے اور صحت مند ذہن کی تعمیر میں یہ ناول معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔

'توبت النصوح' نذیر احمد کا تیسرا ناول ہے اس ناول میں مذہبی امور کے علاوہ سماج کے مسائل خاص طور سے نوجوانوں میں اخلاق کا فقدان، خودسری اور بزرگوں کی نصیحتوں کو نہیں ماننا اور پھر مختلف قسم کی خرافاتوں میں پڑ کر نئی مصیبتوں میں پڑتا ہے۔ اس ناول کا بنیادی موضوع اولاد کی تربیت ہے جو والدین کا فرض اولین ہے۔ اس لئے والدین کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو ایسا نمونہ بنا کر پیش کریں جو اولاد کے لئے قابل تقلید ہو۔ اور اس کے اخلاق و کردار کو متاثر کر سکے۔ اگر والدین کا کردار اور اخلاق اچھا ہوگا وہیں اس کی اولاد بھی اسی کی پیروی کرے گی۔

'توبتہ النصوح' کے تین اہم کردار کہے جا سکتے ہیں ان میں نصوح، کلیم اور

مرزا ظاہر دار بیگ ہیں ۔ یہ ناول انہی تین کرداروں کے گرد بنی گئی ہے ۔نصوح دہلی کے متوسط خاندان کا علمبر دار ہے جو ابتداء میں لا پرواہ اور غیر ذمہ دار ہے اسے اپنے افراد خاندان خاص طور سے بیوی بچوں اور گھریلو ذمہ داریوں سے زیادہ تعلق نہیں ۔ وہ اپنی دنیا میں مگن ہے جیسا کہ عام طور پر اس زمانے کے سماج کا شیوہ تھا۔لیکن ہیضے کی وبا اور تباہ کاری سے جہاں سارا شہر خوف و ہراس میں مبتلا تھا ہر گھر میں موت کا سناٹا پھیلا ۔ نصوح کا گھر بھی اس کی ذد میں آ گیا۔اس کے خاندان میں بھی تین موتیں ہوئی ۔نصوح خود اس بیماری کا شکار ہو گیا۔ڈاکٹر نے نصوح کو نیند کی دوا دے دی جس کی وجہ سے وہ سو گیا۔نیند آنے پر ہو ایک طویل خواب دیکھتا ہے ۔خواب میں اس نے میدان حشر کا نظارہ دیکھا اور خوف سے کانپ گیا آخرت کے انجام سے اس کے انداز فکر میں تبدیلی پیدا ہوگئی ۔اور وہ اصلاح کے ارادے سے نیند سے جا گا۔صحیح معنوں میں نصوح کا خواب ہی اس ناول کی جان ہے ۔ یہ خواب اس کی زندگی میں انقلاب لاتا ہے ۔

کیونکہ خواب سے بیدار ہونے کے بعد وہ طئے کر لیتا ہے کہ وہ اپنی اور اپنے افراد خاندان کی اصلاح کرے گا۔ بیوی اور بچے نصوح کا کہنا مانتے ہیں لیکن اس کا بڑا بیٹا کلیم کسی طرح راہ راست پر نہیں آتا۔ وہ والدین سے ناراض ہو کر گھر چھوڑ دیتا ہے ۔اور اپنے دوست ظاہر دار بیگ کے گھر چلا جاتا ہے ۔

ظاہر دار بیگ کے مکر وفریب کی وجہ سے اس خفت اٹھانی پڑتی ہے ۔ظاہر دار بیگ

اس پر چوری کا الزام لگا کر پولس کے حوالے کر دیتا ہے اور کلیم کو ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔کلیم آخر میں فوج میں بھرتی ہو کر میدان جنگ میں مر جاتا ہے لیکن ماں باپ کا کہا نہیں مانتا۔

اس ناول کے ذریعے نذیر احمد نے سماج کے اس پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے کہ افراد خاندان جس پر سماج کی بنیادیں ٹکی ہیں اگر ان کی تربیت صحیح ہو تو معاشرے میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ظاہر دار بیگ کے کردار کے ذریعے نذیر احمد نے یہ بات بتائی کہ سماج میں ایسے لوگوں کی بہتات تھی جو جھوٹ اور فریب کے ذریعے شریف گھرانوں کے نوجوانوں کو پھنسا کر اپنی ضروریات پوری کر لیتے تھے بناوٹی رہن سہن، لباس و وضع قطع سے وہ لوگوں کو گمراہ کرتے،خود کو رئیس زادہ دکھاتے اصل میں وہ ایک مفلس اور نادار رہتے تھے مگر جھوٹی شان کو بنائے رکھتے۔ناول اپنے آپ میں سماج کے بدلتے ہوئے مزاج کا آئنہ دار ہے۔

نذیر احمد کا ایک اور اہم ناول 'فسانہء مبتلا' ہے اس کو محصنات کے نام سے بھی پہچانا جاتا ہے اس ناول کا موضوع بھی معاشرتی اور سماجی ہے یہ ناول مسلم سماج کی ایک بہت بڑی خرابی سے پیدا شدہ مسائل سے پردہ اٹھاتا ہے۔اس ناول میں نذیر احمد نے مذہب کے واضح حکم و اجازت کے خلاف اپنے نقطہ نظر کی پرزور تائید کی ہے۔

نذیر احمد کے عہد میں مسلمانوں میں کثیر تعداد ازدواج یعنی ایک سے زائد

شادیوں کا رواج تھا۔جس کی وجہ سے کئی سماجی برائیاں پیدا ہوگئی تھیں ۔اسی کو اجاگر کیا ہے ۔نذیر احمد چونکہ خود بھی عالم تھے دینی مسائل میں اچھا درک رکھتے تھے عقد ثانی کی شرعی اجازت کے باوجود وہ اس کو ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں اچھا نہیں سمجھتے تھے ۔اوراس بات کو وہ دلائل کے ذریعے واضح بھی کرتے ہیں ۔انھوں نے اس ناول کے دیباچے میں لکھا ہے ۔

''ان دنوں مجھے یہ خیال ہوا تھا کہ مسلمانوں کی معاشرت میں عورتوں کی جہالت اور نکاح کے بارے میں آزادی دو بہت بڑے نقص ہیں ۔ میں نے ایک نقص کے دفع کرنے میں کوشش کی ہےتو دوسرے نقص کے دفع میں بھی کچھ کرنا ضروری ہے'' [1]

فسانہ ءمبتلا کا مقصد اگر چہ نکاح کے بارے میں آزادی ہے لیکن ضمناً تعلیم اور اولاد کی تربیت کو بھی موضوع بنایا گیا۔اور یہ بتلانے کا کام کیا ہے کہ تعلیم سے لا پرواہی اور اولاد کی تربیت سے والدین کی غفلت کے نتائج برے ہوتے ہیں یہاں تک کہ بچوں کی زندگی برباد ہو جاتی ہے۔تعلیم کے تعلق سے انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ان میں اخلاق کی اصلاح پر خاص زور دیا ہے انھوں نے اپنی ناول کے کردار' مبتلا' کا کردار بیان کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

''' دنیا میں سارے لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے اور نہ پڑھنے لکھنے پر زندگی یا معاش کا انحصار ہے ۔اصل چیز ہے عادت کی درستگی ،مزاج کی شائستگی ،طبیعت کیا صلاح ۔'' [2]

۱: فسانہ مبتلا۔صفحہ ۱۴

۲: فسانہ مبتلا۔صفحہ ۱۴

مبتلا کے کردار کے ذریعے نذیر احمد نے واضح کیا ہے کہ تربیت کی کمی کی وجہ سے وہ کیسے بے راہ رو غلط عادتوں اور غلط صحبتوں کی وجہ سے کس طرح اس کی زندگی تباہ و برباد ہوتی ہے۔اس کی دوسری شادی نے بھی اس کے گھر میں کیا تباہی مچائی اس کا عبرتناک انجام بھی دوسروں کیلئے نصیحت آموز ہے۔

ناول کی ہیروئن ہریالی کی زندگی کی دردناک اوراس کا خوفناک انجام بھی عبرت ناک ہے۔سماج کواس ناول سے بہت سے پیغام ملتے ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ فسانہ ءمبتلا ناول مسلم معاشرے میں ایک سے زائد شادیاں کرنے سے جومختلف مسائل پیدا ہو جاتے ہیں اسی کو بیان کیا گیا ہے۔کثیر ازدواج کے رواج سے برآور گھریلو مسائل، جھگڑے، اولاد سے بے توجہی اور معاشی مسائل سامنے آتے ہیں۔ مذہبی امور یا شرعی مسائل کوبھی موضوع بنایا ہے۔اورشریعت کے نام پر ہونے والے استحصال پر روک لگانے کی تلقین کی ہے۔ایک لحاظ یہ ناول اس دور کے سماج کا آئینہ کہا جا سکتا ہے۔

'ابن الوقت' نذیر احمد کامشہور ناول ہے۔ یہ ناول بھی ایک معاشرتی ناول ہے کہا جا تاہیکہ ابن الوقت نذیر احمد کے آخری دور میں لکھا گیا۔ جب وہ حیدرآبا سے وظیفے پر سبکدوش ہوئے اس وقت تک ان کے سیاسی اورسماجی تصورات پوری طرح سے پختہ ہو

چکے تھے مغربی اور مشرقی تہذیب کی آمیزش اس کی خوبیاں اور خامیاں لوگوں کے سامنے آرہی تھیں۔ان تمام تہذیبی اور معاشرتی تبدیلیوں پرنذیر احمد کی گہری نظر تھی ۔نذیر احمد نئی روشنی اور سماجی رویوں کے حامی ضرور تھے۔لیکن وہ ایسے معاملات تک محدود تھے جن سے سماج میں کچھ اچھی اور نیک طریقہ کار پر مبنی اور سماج کے لئے مفید بھی ۔وہ مانتے تھے کہ اچھی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے نئی چیزوں کو اپنایا جائے نہ کہ روایات کو چھوڑ کر مغربی اندھی تقلید کے وہ مخالف تھے۔خاص طور سے ایسی تقلید جو انسان کو سماج سے علحدہ کردے وہ انھیں پسند نہیں تھے۔دوسرے اپنی جڑوں سے کٹ جانے سے جو نقصانات ہوتے ہیں اور اس کے جو برے نتائج پڑتے ہیں اسی کو ابن الوقت ناول میں پیش کیا۔ابن الوقت اس ناول کا ہیرو ہے۔اپنی پرانی وضع کو چھوڑ کر انگریزی طرز اختیار کر لیتا ہے۔جو مشرقی طرز زندگی کے مقابلے میں بہت مہنگا ہے۔کچھ دنوں تک معاملہ چلتا ہے۔لیکن رفتہ رفتہ اخراجات زندگی میں اس قدر اضافہ ہو جاتا ہے کہ وہ مقروض ہو جاتا ہے۔مغربی تمدن کی پیروی میں غلو کرنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان مذہب سے بیگانہ ہونے لگتا ہے۔ابن الوقت کے عقائد میں بھی خلل پڑنے لگا،یعنی ہر دینی مسئلہ اسے عقل کے خلاف نظر آنے لگا۔اوراس نے دینی مسائل کی تاویلیں شروع کر دیں۔

اس ناول کا کردار حجت الاسلام اسے سمجھاتا ہےلیکن وہ غلط راستے پر چلا جاتا ہے اوراپنے مذہب سے دور ہوتا ہے۔جس سے بیگانے اور بیزار ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک

کہ انگریز جن کی پیروی میں اس نے اپنے سماج اور اپنوں کو ٹھکرا دیا تھا وہ بھی ابن الوقت کی بناوٹی روش کو ناپسند کرنے لگے۔آخرکار ابن الوقت کو اپنے کردار پر پچھتانا پڑا۔

دراصل اس ناول میں نذیر احمد نے یہ بات ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو ہمیشہ اپنے سماجی روایتوں اور اخلاق و اقدار جیسی جڑوں سے منسلک رہنا چاہئے۔اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے ہیں ان کا انجام عبرت ناک ہوتا ہے۔

اس بات کو ثابت کرنے کیلئے نذیر احمد نے اپنی ناول ابن الوقت میں حجت الاسلام کا کردار پیش کیا۔ جو اپنی روایات سے پوری طرح جڑا ہوا ہے۔اپنی وضع کو قائم رکھتا ہے۔اور کسی بھی قیمت پر اپنی مذہبی اور مشرقی وضع کو چھوڑنے پر تیار نہیں۔جس کی وجہ سے اسے سماجی طور پر عزت و احترام حاصل تھا۔نذیر احمد نے ان دونوں کرداروں کے ذریعے انسیسویں صدی کے مسلمانوں کی سماجی اور نفسیاتی زندگی کے تضاد کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مغربی تہذیب وتمدن کی نقالی نے جو ذہنی انتشار کی کیفیت پیدا کی تھی اس کی بھی عکاسی کی ہے۔ساتھ ہی اس زمانے کے سیاسی وسماجی حالات کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔

'ابن الوقت' ناول اس دور کی حقیقی زندگی اور سماجی فکر و انداز کی ایک معاشرتی دستاویز کہی جاسکتی ہے۔ یہ ناول جب سائع ہوا تو لوگوں نے کہا کہ ابن الوقت کے کے

پردے میں سرسید کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے انگریزی طرز معاشرت کو اختیار کرلیا تھا 'حیات النذیر' کے مصنف سید افتخار عالم نے لکھا ہے کہ سر سید احمد خان کے فرزند سید محمود کو یہ شکوہ تھا کہ نذیر احمد نے ابن الوقت سر سیّد پر لکھی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک ادبی تحریک تھی جس کے ذریعے معاشرے کو نئ تعلیم کی روشنی میں زندگی کو خوشگوار اور ترقی پذیر بنانا مقصود تھا۔ نذیر احمد چونکہ اخلاق واقدار کے پاسدار تھے اور انگریزی طرز معاشرت کی خرابیوں سے انھیں نفرت تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اسلامی شعار سے بیگانگی اختیار کر کے بے ہودہ ورغیر اسلامی طریقہ کار کو نئ نسل اپنائے۔

'ابن الوقت' ناول میں نذیر احمد کے دور کی تمام تر سماجی زندگی اور نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی انگریزی تقلید تھی۔ جسے وہ لوگوں کے سامنے رکھ کر اپنی قدیم اسلامی روایت کی اہمیت وافادیت کو رکھنا چاہتے تھے۔ اس لحاظ سے 'ابن الوقت' اپنے دور کے سماجی مسائل سے لبریز ناول کہی جاسکتی ہے۔

ڈپٹی نذیز احمد کا چھٹا ناول 'ایامیٰ' کے عنوان سے ہے۔ جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا اس ناول میں مسلمانوں کا اہم مسئلہ عقد بیوگان سے متعلق شرعی مسئلہ ہے۔ بیوہ عورتوں کی دوسری شادی کی ضرورت پر ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس مسئلہ پر سماج کی بے رُخی اور عورتوں پر ہونے والے مظالم کو اجاگر کرنے کا اہم کام کیا ہے۔

'ایامیٰ' اس ناول کا مرکزی کردار آزادی بیگم ہے۔اس کے والد روشن خیال انسان ہےاور والدہ بے حد قدامت پسند ہے۔ماں باپ کے نظریات متضاد ہیں جس کی وجہ سے آزادی بیگم ہمیشہ کشمکش میں مبتلا رہتی ہے۔ چاہے معاملہ تعلیم کا ہو یا شادی کا ماں ہمیشہ ہی اسے پابند صوم وصلواۃ بنا کر رکھنا چاہتی ہے۔لیکن باپ انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کا دلدادہ ہے۔آزادی بیگم ذہین اور سمجھدار تھی۔وہ ماں کی تربیت کے بجائے باپ کی تعلیم کا اثر قبول کرتی ہے۔لیکن اس کی ماں جو کہ ایک مولوں خاندان سے تعلق رکھتی ہے وہ اپنے بیٹی کی مرضی جانے بغیراس کی شادی ایک مولوی مستجاب سے کر دیتی ہے۔مولوی مستجاب کوآزادی بیگم اپنے طبیعت کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔کچھ دنوں بعد اس کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے۔اس کے بعد آزادی کی زندگی میں ایک خلاء پیدا ہو جاتا ہے جو کسی طرح نہیں بھرتا۔آزادی بیگم شوہر کے انتقال کے صدمے کو شدت سے محسوس کرتی ہے۔اس صدمے سے ابھرنے کے بعد آزادی اپنی دوسری شادی سے متعلق غور کرتی ہے۔لیکن فیصلہ نہیں کر پاتی۔شدید بیمار بھی ہو جاتی ہے اور ایک وصیت کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے۔

آزادی بیگم کی وصیت ہی اس سارے ناول کا نچوڑ کہی جاسکتی ہے۔جس میں اس نے عقد ثانی کی اہمیت اور ضرورت پر ذور دیا تھا۔وہ دوسری شادی سے متعلق کچھ اس طرح رقمطراز ہے۔

''ان بے چاریوں کے شوہر فوت ہوئے ہیں نہ کہ وہ ضرورت فوت ہوئی ہے جس کی وجہ سے دنیا میں نکاح ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے خود ان کے پہلے نکاح ہوئے تھے''

اس وصیت کو پڑھنے والے پر اس قدر اثر ہوتا ہے کہ وہ دل میں یہ فیصلہ کر کے اٹھتے ہیں کہ بیواؤں کے ساتھ ناانصافی اور ظلم وستم نہیں ہونے دینگے۔ خدا اور رسول کے حکم کے مطابق بیواوئں کی دوسری شادی کو ممکن بنائیں گے۔ اوران کی تکلیف دہ اور اذیت ناک زندگی سے چھٹکارا دلائیں گے۔

اس ناول میں نذیر احمد نے ایک لڑکی کی زندگی کو کنواری سے بیوگی تک پیش آنے والے واقعات کو اور زندگی میں پیش آنے والے نشیب وفراز، احساسات وجذبات کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کے معاشرے یا سماج میں غیر متوازن پہلووئں کی عکاسی کی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا آخری ناول 'رویائے صادقہ' ہے۔ اس ناول میں انھوں نے اپنے مذہبی عقائد کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ ناول کی ہیروئن صادقہ بچپن سے سچے خواب دیکھتی اور اسے بیان بھی کرتی ہے۔ اس بنا پر وہ ایک ایسی لڑکی مشہور ہو چکی ہے جس پر جن، بھوت کا سایہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی دو چھوٹی بہنوں کی شادی تو ہو جاتی ہے لیکن اس کا رشتہ نہیں ہو پاتا۔

آخر کار ایک دن علی گڑھ کے ایک طالب علم سیِد صادق کے ذریعے صادقہ کے والد سے شادی کے بارے میں بات کرتا ہے۔صادقہ کے والد اس کو منظور کر لیتے ہیں اور صادقہ کی شادی سید صادق سے کر لیتے ہیں۔

سیّد صادق ایک ایسا نوجوان ہے جو عقلی مذہب کا قائل ہے اور زندگی کے ہر مسئلے کو عقل سے حل کرنا چاہتا ہے۔اور سمجھ نہیں پاتا جب یہ مسئلہ کسی طرح سلجھتا نظر نہیں آتا تو پھر خدا سے رجوع ہوکر مدد مانگتا ہے اس کے منہ سے بے ساختہ درج ذیل کلمات ادا ہوئے۔

''اے خدا اگر واقع میں تو خدا ہے جیسا کہ تمام اہل مذاہب تجھ کو مانتے ہیں تو مجھ کو ورشہ حیرت سے نکال اور حق بات میرے دل میں ڈال دے''

ادھر یہ جملہ پورا ہوتا ہے ادھر صادقہ نیند سے بیدار ہوتی ہے۔اس نے خواب دیکھا ہے کہ ایک بزرگ صادق کی الجھنوں کو سلجھا رہے ہیں اور اس کے سوال کے نہایت تشفی بخش جواب دے رہے ہیں۔صادق کے کہنے پر وہ خواب کا سارا ماجرا سوال و جواب کی شکل میں لکھ لیتی ہے۔صادقہ کا یہ خواب ہی دراصل ناول کا اصل مقصد ہے۔ نذیر احمد نے ایک بزرگ کے ذریعے سید صادق کی ذہنی کشمکش اور شک وشبہات کو دور کرنے کی کوشش میں ذورِ قلم صرف کر دیا ہے۔اور اپنے مذہبی عقائد استدلالی انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔مغربی تعلیم کے اثرات نے مسلمانوں کی نوجوان نسل میں وسوسے پیدا کر دئے

تھے۔ان سب کو دلیلوں سے رفع کرتے ہیں آخر کارراہ راست سے بھٹکا ہوا صادق سیّد ہے اور سچے راستے پر لوٹ آتا ہے۔

اس ناول میں نذیر احمد نے انگریزی تعلیم سے لگاؤ اور اس کی وجہ سے مذہبی اور شرعی اصولوں کو درگزارنے کا اور اپنے مذہبی عقیدے سے دور جانے اور پھر لوٹ آنے کو موضوع بنایا ہے۔کہا جاسکتا ہے کہ نذیر احمد نے ایسے دور کے سماجی ڈھانچے کے تانے بانے کو بچائے اور نئی تعلیم کے اثرات سے انھیں نجات دلانے کے لئے یہ ناول لکھا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا زمانہ دراصل ۱۸۵۷ء کے المناک حادثہ سے پیدا شدہ ایک بحران افراتفری اور بے چینی واضطرابی کیفیت کا زمانہ تھا۔مسلمانوں کی حالت انتہائی مجبور و بے کس قوم کی ہوگئی تھی۔انگریزوں نے صاحب اقتدار مسلمانوں کو چن چن کر پھانسی دے دی تھی۔خوف و براسی میں ایک زندہ قوم اپنے مستقبل سے مایوس ہوگئی تھی۔ایسے پرآشوب دور میں مذہبی اداروں میں لوگ سکون کی تلاش میں جمع ہونے لگے تھے۔لوگوں میں کئی طرح کے شکوک و شبہات نے جنم لینا شروع کردیا تھا۔چنانچہ سازشیں رچی جاتی تھی۔انگریزوں کی مخبری کرنے والے لوگ حاکم قوم کے وفادار کہلاتے تھے۔انگیزوں کو ڈر تھا کہ مسلمان پھر سے اپنا اقتدار حاصل کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔اس لئے انھوں نے مسلمانوں پر کئی طرح ظلم کرتے انھیں اتنا کمزور بنادیا کہ وہ احساس کمزروی کا شکار ہوگئے۔

مسلم سماج میں کئی برائیاں آئیں تھیں ۔ وہ آپسی رقابت، حسد، جلن کا شکار ہونے لگے تھے ایسے میں کچھ لوگ تھے جو سماج میں پھیلی ہوئی اس بے چینی اور اضطراب سے قوم کو نکال کر نئے سرے سے ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کیلئے کمر بستہ ہو گئے ۔ ان میں سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء قابل ذکر ہیں ۔

۱۸۵۷ء سے قبل بہادر شاہ ظفر کی حکومت تھی جو قلعہ تک محدود تھی ۔ شعر و شاعری کا دور چلتا اور معاشرے میں انگریزوں کے مظالم بڑھتے رہتے تھے ۔ تعلیم کا فقدان تھا صرف عروض فقہ اور دینی تعلیم عام تھی نئے علوم و فنون سیکھنے سے مسلمان کتراتے تھے ۔

ادھر دیگر قومیں نئے نئے علوم سیکھ کر انگریزی حکومت میں بڑے بڑے عہدے حاصل کر رہی تھی اور مسلمان لکیر کے فقیر بنے ہوئے تھے ۔ لیہذا انھیں نئے علوم سیکھنے اور انگریزی تعلیم کی طرف راغب کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا ۔

معاشرے میں عورتوں کی حالت بھی انتہائی پست تھی ۔ انھیں تعلیم سے دور رکھا جاتا تھا جہالت عروج پر تھی اسی طرح کثیر ازدواج کا رواج عام تھا لوگ چار چار شادیوں کے طرفدار تھے ۔ جس کی وجہ سے آئے دن گھریلو مسائل میں الجھ کر مرد اپنے فرائض اور امور خانہ داری کے ساتھ ساتھ اولاد کی تربیت سے بھی بے نیاز ہو گئے تھے ۔ جس کی وجہ سے نئی نسل بے راہ روی کا شکار ہو گئی تھی ۔

بے روزگاری اور معاشی مسائل سر ابھار رہے تھے ۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت نہ

کے برابر تھی ایسے ماحول کو بدلنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ اپنے گھر سے اصلاح کا کام شروع کیا جائے چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے لڑکیوں کی تربیت کی خاطر امور خانہ داری اور اپنے حسن وسلوک سے گھر کو جنت بنانے کا طریقہ سکھانے کے لئے مراۃ العُروس نامی ناول لکھی۔ جس میں انھوں نے اصغری بیگم کے کردار کو مثالی کردار بنا کر پیش کیا۔ جدید تعلیم کی اہمیت اور لڑکیوں کو اپنے والدین اور سسرال والوں کو اپنے حسن سلوک اور برتاو سے خوش رکھنے کی تلقین کی۔ اس ناول نے مقبولیت حاصل کر لی اور مسلم گھرانے کی لڑکیاں ناول میں بتائے گئے طریقہ کار کو اپنا کر اپنی زندگی میں خود اعتمادی، جہالت اور جنرل معلومات حاصل کر کے خوشحال زندگی گزارنے لگی۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ہی معاشرے میں تبدیلی لا سکتی ہے۔ یہ بات نذیر احمد نے اپنی قوم میں رائج کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔

اسی طرح 'توبت النصوح' میں مذہب اور اس کے اصولوں کو اپنا کر ایک بگڑا ہوا آدمی کس طرح راہ راست پر آ جاتا ہے۔ اس بات کو نصوح کے کردار کے ذریعے سمجھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ موت کے ڈر سے انسان کے اندر فکر میں جو تبدیلی آتی ہے اس بات کو نذیر احمد نے اس ناول میں بیان کیا ہے۔

فسانہء مبتلا بھی مسلم سماج کی برائیوں کو دور کرنے کا درس دینے والی ناول ہے۔ اولاد کی تربیت کے ساتھ ساتھ ایک سے زائد شادیوں کے رواج سے پیدا ہونے والے

مسائل اس کا موضوع ہے۔ ساتھ ہی دینی اور شرعی اعتبار سے بے راہ رو ہوئے سماج کو راہ راست پر لانے کی تلقین یہ ناول کرتی ہے۔

'ابن الوقت' میں تو انگریزی تعلیم و تربیت کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کو اچھا گُر مانا گیا ہے۔لیکن ساتھ ہی انگریزی تعلیم کے بڑھتے ہوئے رجحان اور تہذیب و تمدن کی اندھی تقلید سے پیدا شدہ مسائل کو بھی اجاگر کیا ہے۔

انگریزوں کی پیروی کرنے میں اسلامی تہذیب و شعار کو خیر باد کہنے والے اشخاص کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ روایتی اقدار و شناخت کے مٹنے کے خطرے سے آگاہ کیا گیا ہے۔ ابن الوقت کا کردار روایتی معاشرے اور تہذیب و تمدن کا دلدادہ ہے۔ سماج اس وقت متضاد سوچ و فکر میں گھرا ہوا تھا اور لوگ تذبذب کا شکار تھے کہ کریں تو کیا کریں ۔

'ایامی' اور 'رویائے صادقہ' بھی معاشرے کے الجھے ہوئے مسائل کے موضوع پر لکھے گئے ناول ہیں ۔ خاص طور سے تعلیم نسواں ، ازدواجی زندگی ، لڑکیوں کی تربیت وغیرہ اس دور کے معاشرے کے اہم موضوع رہے ہیں ۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے سات ناولوں کے ذریعے درج ذیل مسائل کی طرف اپنے قاری کو راغب کرنے کی کوشش کی تھی اسلئے معاشرے کی اصلاح کے لئے انھوں نے سماجی نکتہ نظر سے غور کیا ہے۔

۱)	لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر زور دیا اور انھیں اپنی زندگی کو خوشحال بنانے کے اصول بتائے۔ دین و مذہب کے ساتھ ساتھ بڑوں کا ادب و لحاظ اور ان سے اچھا برتاو کرنے کی تلقین کی۔

۲)	تعلیم اخلاق اور تربیت خانہ داری کو عام کرنے اور معاشرے کو اس کی اہمیت سے آگاہ کرنے کی کوششیں کی۔ کیونکہ نذیر احمد کے دور میں اندھی تقلید معاشرتی زندگی سے متعلق عام معلومات سے بے بہرہ افراد سماج میں مزید گمراہی پھیلا رہے تھے۔ انھیں روکنا ان کا مقصد تھا۔

۳)	نئی نسل اپنے بزرگوں کی نصیحت ماننے کو تیار نہ تھی۔ انگریزی تعلیم کی وجہ سے نافرمانی عروج پر تھی۔ قدامت پرستی سے انحراف کرتے ہوئے اپنی من مانی کرنے والی نئی نسل کس طرح مصیبتوں کا شکار ہوتی ہے، انھیں بچانے اور راہ راست پر لانے کی کوشش نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں کی ہے۔ کہا سکتا ہے نذیر احمد نے اپنے ناولوں کے ذریعے اس دور کے سماج کی عکاسی بھی کی ہے۔ اور اس سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کر کے ترقی کے راستے پر گامزن ہونے کے اصول بھی بتائے ہیں۔ اس لحاظ سے سرسیّد کے بعد ڈپٹی نذیر احمد اہم شخصیت کہے جا سکتے ہیں

باب پنجم

ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں میں نسائی مسائل

ڈپٹی نذیر احمد کی ناولوں میں عورتوں کے مسائل کی عکاسی

ڈپٹی نذیر احمد اردو کے پہلے ناول نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ان کا دور ۱۸۵۷ء کے بعد کا دور ہے۔جب مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوگئی تھی، شمالی ہند میں انگریزوں کا عمل دخل بڑھتا جا رہا تھا۔مسلم معاشرے میں ایک بے چینی اورافراتفری کا ماحول تھا۔اگر مسلم معاشرے کی معاشرتی زندگی پر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسلم سماج کئی برائیوں کا شکار تھا۔خاص طور سے مسلم خواتین مختلف مسائل سے گھری ہوئی تھیں۔یوں بھی ہندوستانی تاریخ میں سماج پر مردوں کی اجارہ داری رہی اورعورتوں کو دوسرے درجہ کا رتبہ ملا۔اردو کے ابتدائی ادب پر نظر ڈالی جائے تو اس میں عورت کو کبھی محبوبہ،معشوقہ یا پھر گھریلو نمائش کی چیز سمجھا جاتا رہا ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ امورِ خانہ داری کی تمام تر ذمہ داری عورتوں پر ہی ہے۔دورقدیم کی عورتیں مردوں کے مقابلے گھریلو کاموں پر زیادہ توجہ دیتی رہی۔اردوادب کا ایک بڑا حصہ شاعری میں عورتوں کے حسن کی تعریف اوران کے نازواداپر تخلیق کیا ہوا پایا جاتا ہے۔

فکشن یا افسانوی ادب میں بھی عورتوں کو صرف عشق وعاشقی کے لئے یا پھر جنسی

شئے کے طور پر دکھایا جاتا رہا۔اردو کے داستانوی ادب میں ایسے کئی نسوانی کردار ملتے ہیں جو ہمدردی، وفا اور اپنے چاہنے والے کے لئے جان پر کھیل جانے کا جذبہ رکھتے ہیں ۔الف لیلہ کی داستانوں میں ایسے کئی کردار مل جاتے ہیں ۔طلسم ہوشربا ، ہو یا پھر حاتم طائی کا قصہ، باغ و بہار ہو یا فردوس بریں ، ان تمام داستانوں میں نسوانی کردار اپنی سوجھ بوجھ عقلمندی کے علمبردار دکھائے گئے ہیں ۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب انقلاب ناکام ہوا اور اسے غدر کا نام دیا گیا تو مسلم حکمرانی کرنے والے تخت کا اقتدار چھن گیا۔ انگریزوں نے مسلم نوجوانوں ، جاگیرداروں اور با اثر لوگوں کی جائدادیں ضبط کر لیں ۔اور کئی سماج میں با اثر رتبہ رکھنے والے امیروں کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ یہ وہ پُر آشوب دور تھا جب مسلمان انگریزوں کے ظلم وستم کا نشانہ بن رہے تھے۔ظاہر ہے کہ جب کبھی جنگ و جدال کی نوبت آتی ہے تو اس کا سب سے زیادہ اثر عورتوں اور بچوں پر ہی پڑتا ہے ۔یہی سب کچھ غدر کے دوران ہوا۔

عورتوں کی حالت زار:۔

۱۸۵۷ء میں جاگیرداروں اور نوابوں کی جائیدادیں لُٹ جانے سے اور مردوں کے قتل ہو جانے سے کئی عورتیں بیوہ ہوگئی تھیں ۔ جو شریف خواتین کبھی اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں گئی تھی انھیں روزی روٹی کے لئے دوسروں کے یہاں کام پر جانے کی نوبت آ گئی تھی ۔ وہ عورتیں اپنی عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزارنا دشوار سمجھتی

تھیں۔ان کی حالت ایسی مجبور اور بے بس انسان کے مانند تھی جو ساری تکلیف سہہ کر خاموش رہتا ہے ۔ کچھ مسلم امیر و امراء جو انگریزوں کے مخبر بن گئے تھے وہ بھی ایسی بے کس عورتوں کا استحصال کرتے تھے ۔تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ کئی خواتین نے اس بے رحمی کی زندگی سے چھٹکارا پانے کیلئے موت کو گلے لگا لیا۔ یہ ایسا دور تھا جس نے عورتوں پر قیامت ڈھائی تھی ۔

زمینداروں اور نوابوں کے ساتھ ساتھ انگریز عہدیداروں نے بھی اس دور میں عورتوں پر مظالم کئے ۔کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں عورتوں کی حالت جانوروں سے بھی بدتر ہو گئی تھی ۔

تعلیم کا فقدان:

۱۸۵۷ء کے بعد مسلم معاشرے میں تعلیم سے دوری نے انھیں غربت و افلاس کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یوں بھی ہندوستان میں دینی تعلیم کے مدرسے خال خال ہی نظر آتے تھے ۔تعلیم صرف چند لوگوں کی ضرورت بن گئی تھی ۔ عام انسان اس سے کوسوں دور تھا۔

عورتوں کے لئے تعلیم ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی ۔ان کی زندگی صرف گھر کی چار دیواری میں قید ہو کر رہ گئی تھی ۔جس کی وجہہ سے عورتیں ان پڑھ اور جاہل ہو کر رہ گئی

تھیں۔ذرا ذرا سی بات پر لڑنا، ایکدوسرے کی چغلی کرنا، ایک دوسرے کو دیکھ کر حسد کرنا اور آپسی رنجشوں کو ہوا دینا ہی ان کا مشغلہ بن گیا تھا۔عورتوں کی سمت تعلیم کی بے توجہی نے کئی برائیاں پیدا کر دی تھی۔اور اسے دور کرنا ایک بڑا مسئلہ تھا۔

مذہبی فرائض سے دوری:

یہ بات سچ ہے کہ مذہبی امور اور مذہبی خوشنودی انسان کو روحانی خوشی اور سکون بخشتی ہے۔اور یہ بھی سچ ہے کہ جب مصیبتیں بڑھتی ہیں یا آفتیں آتی ہیں تب انسان مذہب کی پناہ میں چلا جاتا ہے۔مگر جب انسان کی زندگی میں مسلسل تکلیفیں ہی آنے لگیں تو وہ منکر ہو کر مذہب سے دور چلا جاتا ہے۔کچھ اسی طرح کا حال ڈپٹی نذیر احمد کے عہد میں تھا۔کچھ لوگ مذہبی فرائض ادا کرتے وہیں بہت سے لوگ مذہب سے بیزار نظر آتے تھے۔ایسے مذہب بیزار لوگوں کو انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہونے کا موقع مل رہا تھا۔انھیں انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب وتمدن لباس و وضع قطع اپنانے میں مزہ آتا تھا۔جس کی وجہ سے روایتی اقدار پر اور مذہبی غور وفکر پر گہری چوٹ لگ رہی تھی۔ایک ایسا معاشرہ وجود میں آرہا تھا جو انگریزوں کی تائید کرتا اور دنیاوی خواہشوں کی تکمیل کا واحد ذریعہ انگریزوں کی پیروی کرنے کو سمجھتا تھا۔ساتھ ہی قدامت پرست عورتوں سے انھیں خاصی پریشانی ہوتی تھی۔عورتوں میں بے پردگی عام ہونے لگی تھی۔کہا جاسکتا ہے کہ تعلیم سے دوری نے عورتوں میں اپنی ادراک وفہم سے گھر کو خوشحال بنانے

کے بجائے آپس میں الجھنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ یوں تو اسلام نے عورتوں کو مساوی حقوق دیئے لیکن عورتوں کے حقوق سلب کر دیئے گئے تھے۔ مذہبی رہنماء یا مولوی ہی اپنے گھروں میں عورتوں کو شرعی قوانین کے مطابق حقوق دینے سے قاصر تھے۔ جب کہ عورتیں دینی تعلیم سے بھی محروم تھیں اور اپنے حقوق کے لئے آواز اٹھانا بھی نہیں جانتی تھیں۔ مردوں کا حکم ان کے لئے حرف آخر ہوتا تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے معاشرے میں مذکورہ تمام حالات کو بغور دیکھا اور اس حالت کو بدلنے کے لئے وہ اپنی توانائی صرف کرنے لگے۔

اتفاق سے سر سّید احمد خان بھی معاشرے میں پھیلی ہوئی برائی اور احساس کمتری سے اپنے قوم کو نکالنے کے لئے جد و جہد کر رہے تھے۔ انھوں نے اصلاح معاشرے کے لئے تعلیم و تربیت کو اولیت دی اور کئی ایسے فلاحی ادارے قائم کئے جو مسلم معاشرے کی اصلاح میں معاون و مددگار ثابت ہوئے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی لڑکیوں کی تربیت کے لئے تمثیلی قصے لکھے اور اس دور کے خواتین کے مسائل کو بیان کیا۔ انھوں نے دو بہنوں کا قصّہ لکھا۔ یہ دو بہنیں اصغری و اکبری تھیں۔ اصغری سمجھدار و فرمانبردار تھی جبکہ اکبری لاڈ و پیار میں پلنے کی وجہ سے خودسرا اور ضدی ہوگئی تھی۔ جب دونوں بڑی ہوتی ہیں۔ تو اصغری اپنے برتاو اور حسن سلوک سے سسرال میں خوشحال زندگی گزارتی ہے۔ وہیں اکبری اپنے برتاو سے گھر کو جہنم بنا لیتی ہے۔ نذیر احمد نے ان قصّوں کو 'مراۃُ العُروس'

کا نام دیا۔ جو بعد میں ناول کی شکل میں شائع ہوا۔ اصل میں یہ قصہ انھوں نے اپنے لڑکیوں کی تربیت کے لئے لکھا تھا۔ جسے پڑھ کر لڑکیاں امور خانہ داری سے واقف ہو جائے اور خوشحال زندگی گزارنے کے گُر سیکھ لیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں عورتوں کی تربیت ہی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔

اٹھارویں صدی کی پوری طویل مدت انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان آویزشوں میں گذری۔ ایک زمانہ تک انگریز ایک فوجی طاقت اور تاجر قوم کے سوا ہندوستانیوں کے لئے اور کچھ نہ تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب حکومت انگریزوں کے ہاتھ میں چلی گئی تو ان میں ایک نشہ سا پیدا ہوا۔ وہ ہندوستان کے مذاہب، کلچر اور افراد کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لامذہبیت اور عیش پسندی ان کا شیوہ بن گیا تھا۔ انگریز اپنے ساتھ جو اقدار اور ذہن، مزاج وطرز معاشرت لے کر آئے تھے وہ ہندوستانیوں کے لئے قابل قبول نہ تھے۔

انیسویں صدی کے آخر تک انگریزوں نے نظام تعلیم کو عام کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ 'ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر' اپنی کتاب 'ان اے نائنٹینتھ سینچوری' میں رقم طراز ہیں۔

''انگریزوں نے جو نظام تعلیم رائج کیا وہ اس نظام کی جو پہلے سے ہندوستان میں رائج تھا اور جس کی بنیاد ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی اور تہذیبی تصورات پر تھی۔ بیخ کنی کرتا تھا۔''

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیم کی سمت دیکھنے کا رویہ بدل گیا تھا۔ خاص طور سے لڑکیوں کی تعلیم ایک اہم مسئلہ بن کر سامنے کھڑا تھا۔ لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریزی طرز معاشرت اور لا دینیت کی تعلیم لڑکیوں میں عام کی جائے ۔ یوں بھی مسلمانوں میں عورتوں کی تعلیم کا رواج کم تھا ایسے ماحول میں مسلمانوں کی اصلاح معاشرت دینی و دنیاوی علوم کی بازیابی ضروری تھی ۔ چنانچہ نذیر احمد نے اپنی ناول مراۃ العُروس میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کرنے کے لئے جو تمثیلی قصّے لکھے وہ اہم کہے جا سکتے ہیں ۔ بقول شہناز نبی

'' نذیر احمد نے 'مراۃ العُروس' اور ' توبتہ النصوح ' کے ذریعے تعلیم و تربیت کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالی ۔ ' مراۃ العُروس' میں خیر و شر کی نمائندگی کرنے کے لئے اصغری اور اکبری کے کردار تراشے گئے'' [1]

کہا جا سکتا ہے کہ نذیر احمد اپنی ناول 'مراۃ العُروس' کے ذریعے عورتوں کی تعلیم کی اہمیت واضح کرنا چاہتے تھے ۔ کیونکہ اچھی تعلیم و تربیت یافتہ لڑکی گھر و خاندان کے لئے کتنی معاون ثابت ہوتی ہے اور ایک کم تعلیم یافتہ یا جاہل یا بری تربیت کی لڑکی کس طرح خاندان اور اپنی زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے یہی بات وہ مسلم معاشرے کے حوالے سے بیان کرتے ہیں مراۃ العُروس کے بعد فسانۂ مبتلا ناول میں بھی انھوں نے علم کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

[1]: شہناز نبی بحوالہ تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول ۔ صفحہ ۱۲۱

امورخانہ داری:

انسانی سماج میں تہذیب وتمدن اور ثقافت کو کافی اہمیت حاصل ہے ۔یوں تو انسانی سماج مرد اور عورت دونوں پر مشتمل ہے۔اور انھیں دونوں کے مشترکہ افعال و اعمال سے تہذب پروان چڑھتی ہے۔تہذیب ومعاشرت ایک منظّم اجتماعی زندگی کا نام ہے۔جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا سماج میں تبدیلی آتی گئی ۔مردوں کا کام معاشی ذرائع تلاش کرنا اور اپنے افراد خاندان کی کفالت کرنا طئے پایا،جبکہ عورتوں کے لئے گھریلو زمہ داریاں جیسے اولاد کی پرورش،کھانا پکانا اور تمام گھریلو زمہ داریوں کو نبھانا طئے پایا۔ان تمام زمہ داریوں میں امورخانہ داری سب سے اہم تصور کیا جاتا ہے۔

امورخانہ داری سے مُراد وہ فرائض ہیں جوایک صالح معاشرے کی تعمیر میں اہم اوراول کردارادا کرتی ہے۔کہا جاتا ہے آنے والی نسلیں اپنی ماں کی گود میں پرورش پاتی ہیں اگرایک ماں کا رویّہ اپنے افراد خاندان سے جس قدر مانوس ومربوط ہوگا اس کا اثر اس کی اولاد پر پڑے گا۔ایک تہذیب یافتہ معاشرے میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں۔خاص طور پر ماں باپ اور دیگر افراد کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا سلوک،ان کا ادب و احترام بزرگوں کی خدمت اور سبھی افراد خاندان سے مل جل کر رہنے کا طریقہ کار ضروری ہو جاتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلم معاشرے میں ایک بکھراو سا آ گیا تھا۔عورتیں ظلم کا شکار ہوگئی تھیں اور نفسیاتی طور پر احساس کمتری کا شکار ہوگئی تھیں وہ خود کو

بے سہارا و غیر محفوظ سمجھتی تھیں ۔ ایسے حالات میں امور خانہ داری کی زمہ داری سے وہ دور ہوتے دکھائی دے رہی تھی ۔ کئی متوسط گھرانے کی خاتون بے بسی و بے کسی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھیں ۔ عورتوں کے اس ذہنی رجحان کو یہ احساس کمتری کو دور کرنا سب سے بڑا مسئلہ تھا ۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے دور کے حالات کا مشاہدہ کیا ، وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس زمانے کی عورتیں جن مسائل سے گزر رہی ہے انکا اثر اپنی لڑکیوں پر پڑے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ناولوں میں عورتوں کی زمہ داری اور امور خانہ داری سے متعلق واقعات بیان کئے ۔ خاص طور سے عورتوں میں جہالت کو ختم کرنا ، اسلامی شعار کے متعلق زندگی گزارنا ، بزرگوں اور افراد خاندان کی عزت کرنا ، انکی خدمت گزاری کو اہم سمجھنا جیسی باتوں کو موضوع بنایا ۔ انکے بیشتر ناول اسی موضوع پر لکھے گئے ہیں ۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نذیر احمد نے اپنے دور کے دیگر مسائلوں سے زیادہ اہمیت و اصلاح کی ضرورت ، نسائی مسائل کو اجاگر کرنا اور اس میں اصلاح پیدا کرنا فرض اولین سمجھا ۔ ان کی ناول 'مراۃ العُروس' ہو یا 'بنات النعش' ، 'ابن الوقت' ہو یا 'رویائے صادقہ' میں وہ اسی بات کی تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ عورتوں کو اپنے فرائض میں امور خانہ داری یا گھریلو زمہ داریوں کا احساس ہے ۔ عورتوں میں اگر گھریلو زمہ داریوں کا احساس پروان چڑھنے لگے اور وہ اسے اپنا فرض سمجھے تو ایک صالح معاشرے کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے ۔

مذہبی روایات کی پاسداری:

نذیراحمد کے دور میں مذہبی رجحان کافی بڑھ چکا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء میں جو آفتیں ناگہانی آئی اس سے لوگ زیادہ پریشان ہو گئے۔ اور اپنی اس بے چینی کو انھوں نے مذہب کی پناہ میں سد باب ڈھونڈا۔ اس دور کے لوگ تمام معاملات ومسائل کا حل مذہب اور ماضی میں تلاش کرتے تھے اسلئے اسلامی نکتہ نظر کے مطابق زندگی گزارنا ضروری سمجھتے تھے۔ بقول سر سیّد احمد۔

''بس میں نے مذاہب کی صداقت دریافت کرنے کے لئے اور مذاہب کی جانچ کے لئے بھی یہ اصول قرار دیا ہے کہ وہ فطرت انسانی کی مطابق ہے یا نہیں ۔۔ اور مجھ کو یقین ہوا ہے کہ اسلام اس فطرت کے مطابق ہے۔''

اس قول سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لوگوں میں مذہبی رجحان کافی بڑھ چکا تھا۔ کچھ لوگوں کا ماننا یہ بھی تھا کہ مذہب اسلام کے مطابق عورتیں اپنے شوہر کی تابعدار بنے، عورتوں کو اپنے شوہر کے حکم بجالانے چاہئے، بغیر مرد کی اجازت کے کوئی کام نہیں کرنا چاہئے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق خواہشات کی تکمیل نہیں کرسکتی۔ یہ رویّہ اسلام کی شبیہ کو داغ دار کرنے والا تھا۔ کیونکہ اسلام نے عورتوں کو مساوی حقوق دئے۔ اس دور کے علماء کو یہ ڈر تھا کہ انگریزی تہذیب و معاشرت کو اپنانے کی وجہ سے مسلم معاشرت میں خاص طور سے عورتوں پر اثرات مرتب ہونگے۔ عورتوں میں تعلیم کی وجہ سے بے پردگی

،مردوں عورتوں کی مخلوط مجلس وعورتیں ناچ گھر،کلب وغیرہ کا رواج عام ہوگا۔اسی لئے اسلامی روایات کی پاسداری اوراس کے تحفظ کوضروری سمجھتے تھے۔اور جہاں تک ممکن ہو سکے وہ عورتوں پر پابندیاں عائد کرتے تھے خاص طور پر مذہبی روایتیں اوراس پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے تھے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی ناولوں میں خاص طور سے فسانہء مبتلا میں مسلم سماج کی اصلاح کے لئے واقعات بیان کئے۔انکے تمام ناول اپنے زمانے کی سماجی حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں۔انھوں نے زندگی کے حقائق اوراس کے ٹھوس پہلوؤں کو ہمیشہ سامنے رکھا۔ان کا ماننا تھا کہ خرابیوں کواجاگر کئے بغیر سماج کو صحیح راہ دکھانا ممکن نہیں۔اسی لئے انھوں نے عورتوں سے ہونے والی ناانصافی اور مذہبی احکامات کی خلاف ورزی متعلق مسئلہ کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

گھریلو تنازعات:

یہ بات توسبھی جانتے ہیں کہ متوسط عہد میں مشترکہ خاندان کا رواج عام تھا۔جس کی وجہ سے کئی طرح کے مسائل سامنے آجاتے تھے۔گھر کے بزرگوں کا عمل دخل بہت زیادہ ہوجاتا تھا۔بزرگوں کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا۔خاندان کا بزرگ اپنے طور پر تمام افراد خاندان پر نصیحتیں کرنے کا عادی تھا۔جو نئی نسل کو پسند نہیں آتا تھا۔اسی طرح ایک ہی مکان میں کئی عورتیں جن کے رشتے مختلف ہوتے تھے رہتی تھیں

۔ان کے آپسی تنازعات کی وجہ سے گھریلو زندگی متاثر ہوتی تھی۔ خاص طور سے عورتوں میں جلن حسد اور چغلی جیسے بری عادتیں پروان چڑھ رہی تھی۔جس کی وجہ سے زمین جائیداد کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق اور فرائض کے مسائل سرابھار رہے تھے۔تعلیم کی کمی اور جہالت کی وجہ سے نئی نسلیں بھی خاص طور سے لڑکیاں ان کی سازشوں کا شکار ہو جاتی تھی۔چھوٹی چھوٹی باتوں پرلڑائی جھگڑے عام بات تھی ۔ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی ناولوں میں ان باتوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔خاص طور سے بنات النعش ناول میں انھوں نے تعلیم یافتہ لڑکی کس طریقے سے معاشرے کو بدل سکتی ہے ۔نئے علوم کے معلومات سے نیا شعور بیدار کرسکتی ہے۔اس بات کو بیان کیا۔ساتھ ہی ایک بدسلیقہ لڑکی خوشحال زندگی کوبھی کس طریقے سے مشکل بنادیتی ہےاس کی مثالیں پیش کیں۔

ڈپٹی نذیراحمد نے اپنی ناولوں میں نسوانی مسائل کے طور پر گھریلو تنازعات آپسی رقابتیں امیرعورتوں کے غریب عورتوں پر کئے جانے والے طنز و طعنے کوموضوع بنایا۔

کثیرازدواجی طریقہ کار(ایک سے ذائدشادیاں):

ڈپٹی نذیراحمد کے عہد میں مسلم معاشرے میں ایک سے ذائدشادیاں کرنے کا رواج عام تھا۔اس کی وجہ سے ایک تو مذہب اور دوسرا دولت کی فراوانی کا۔مذہب اسلام نے چارشادیوں کی اجازت دی۔اس کومردوں نے اپنے حق میں گردانا اورایک سے ذائدشادیوں کارواج عام ہوتا گیا۔

محصنات یا فسانہء مبتلا اس ناول میں انھوں نے ایک سے ذائد شادیاں کرنے پر ان کی برائیوں اور خامیوں کا اظہار کیا ہے۔نذیر احمد خود عالم تھے اور دینی مسائل سے واقف بھی تھے اسی لئے انھوں نے اس موضوع کو ناول کی شکل میں پیش کیا۔

اس زمانے میں ایسے اہم اور نازک مسائل پر قلم اٹھانے کی جرات بڑے بڑے عالم دین بھی نہیں کر سکتے تھے۔اس ناول میں نذیر احمد نے مذہب کے واضح حکم اور اجازت کے خلاف اپنے نکتہ نظر کی پر زور تائید کی ہے۔عقد ثانی کی شرعی اجازت کے باوجود نذیر احمد ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔اس بات کو وہ اس طرح واضح کرتے ہیں۔

''انہی دنوں مجھے یہ خیال ہوا تھا کہ مسلمانوں کی معاشرت میں عورتوں کی جہالت اور نکاح کے بارے میں آزادی دو بہت بڑے نقص ہیں میں نے ایک نقص کے رفع کرنے میں کوشش کی ہے تو دوسرے نقص کی دفاع میں بھی کچھ کرنا ضروری ہے۔'' [1]

نذیر احمد یہ مان کر چلتے تھے کہ ایک سے ذائد شادیاں کرنے سے گھریلو توازن بگڑ جاتا ہے۔ایک مرد چار بیویوں کی زمہ داریاں پوری کرنے میں ناکام بھی ثابت ہوتا ہے ۔چاروں بیویوں کی خواہشات ان کی ضروریات اور کفالت پوری کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔جس کی وجہ سے اس کی بیویوں میں رسہ کشی تو ہوتی ہی تھی ساتھ ہی اولاد کی تربیت بھی متاثر ہوتی تھی۔چاروں بیویاں کبھی کبھی اپنی سوتیلی اولادوں سے بےاعتنائی برتتی

[1] نذیر احمد فسانہء مبتلا دیباچہ۔صفحہ۲

تھیں ۔ بلکہ وہ ایکدوسرے کی اولادوں سے سوتیلا سلوک بھی کرتی تھی ۔ان کی تعلیم وتربیت بھی اثر انداز ہوتی تھی ۔اسلئے ایسے مسئلوں کو ناول کا موضوع بنا کر مبتلا کے کردار کے ذریعے نذیر احمد نے دوسری شادی سے پیدا ہونے والے عبرت ناک انجام کونصیحت آمیز بنا دیا ہے ۔اس ناول کے اختتام میں انھوں نے لکھا ہے کہ دو بیبیاں نہ کی جیوز نہار بھول کر۔

بیوہ عورتوں کے نکاح ثانی کا مسئلہ:

شادی ،خاندان اورقرابت داری ہی ایسے اہم ادارے ہیں جو ہر سماج میں پائے جاتے ہیں ۔ان تینوں کا آپس میں تعلق ہے ۔شادی کی تعریف مرد وزن میں ایک دیرپا ربط ہے جوافزائش نسل کے عمل سے آگے اولاد کی پیدائش کے بعد تک آفاقی حیثیت رکھتا ہے ۔بعض مذہبی اداروں میں شادی ایک مقدّس رسم ہے ۔

حضرت محمّدﷺ کے مطابق شادی افزائش نسل اورنسل کی برقراری کی زمہ داری سنبھالنے اورعورت کی محبت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شادی خاندان کی تشکیل کی بنیاد ہے ۔

مسلمانوں میں دواہم فرقے ہیں سُنّی اورشیاء ۔ان دونوں میں شادی کے طریقہ کار مختلف کہے جاسکتے ہیں ۔عہد وسطی میں مسلم سماج میں کثیر زوجگی کا طریقہ کار تھا ۔لیکن عورتوں میں اس کی ممانعت تھی ۔عورتیں جن سے شادی کی جاتی تھی مرتے دم تک اسی

کے نام سے زندہ رہتیں۔کبھی کبھی جب شوہر کا انتقال ہو جاتا تو بیوہ عورت کے لئے زندگی گزارنا اجیرن ہو جاتا۔گھر کے دیگر افراد اس پر طرح طرح کے ظلم و زیادتیاں کرتے ، بیوہ عورت جیتے جی موت کی گود میں چلی جاتی ۔ یہاں تک کہ بیوی کے حقوق میں شامل وراثت اور جائیداد یں حصّہ وغیرہ سے محروم کر دی جاتی تھی ۔ عام بات تو یہ بھی تھی کہ بیوہ عورتیں کسی خوشی کی تقریب میں شریک نہیں ہو پاتی ۔انھیں بدشگون سمجھا جاتا تھا۔جبکہ اسلام میں بیواؤں کی شادی جائز قرار دی گئی ۔

ڈپٹی نذیر احمد نے 'ایامی' اس ناول میں ایک شرعی مسئلہ بیواؤں کی شادی کی ضرورت کو اٹھایا ۔اس مسئلے پر سماج کی بے رُخی اور عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم کو اجاگر کیا۔اس ناول کا مرکزی کردار آزادی بیگم ہے۔اس کے والد روشن خیال ہے لیکن والدہ قدامت پسند ہے۔ماں باپ کے نظریات الگ ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ کشمکش میں رہتی ہے۔آزادی بیگم باپ کی طرح روشن خیال ہے۔اس کی ماں آزادی کی شادی ایک مولوی خاندان سے کر دیتی ہے۔جو اسے پسند نہیں ہے۔لڑکی کی مرضی جانے بغیر مولوی مستعیب سے ہو جاتی ہے۔وہ اپنے آپ کو مولوی مستعیب کے مطابق ڈھال بھی دیتی ہے۔لیکن کچھ دنوں بعد اس کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے۔شوہر کے انتقال کے بعد آزادی بڑا صدمہ محسوس کرتی ہے۔اس صدمے سے ابھرنے کیلئے وہ دوسری شادی کرنے پر غور کر رہی ہے۔لیکن کچھ فیصلہ نہیں کر پاتی ہے۔شدید بیمار ہو جاتی ہے اور بیماری کی حالت میں ایک وصیت کر کے مر جاتی

ہے۔ دوسری شادی کے سلسلے میں اس کا کہنا ہے کہ ''ان بیچاریوں کے شوہر فوت ہوئے ہیں نہ کہ وہ ضرورت فوت ہوئی ہے جس کی وجہ سے خود ان کے پہلے نکاح ہوئے تھے۔'' [1] اس وصیت کا پڑھنے والوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اور ناول کا قاری یہ فیصلہ کر کے اٹھتا ہے کہ بیواؤں کے ساتھ ناانصافی اور ظلم وستم نہیں ہونے دینگے۔ خدا اور رسول کے حکم کے مطابق بیواؤں کی دوسری شادی ممکن بنائینگے۔ ایامی اس ناول میں نذیر احمد نے ایک عورت کی کہانی 'کنوارپن سے بیوگی تک' اس انداز سے بیان کی ہیکہ اس مظلوم عورت کی زندگی کے تمام نشیب وفراز احساسات و جذبات ایک حقیقت بن کر سامنے آ جاتے ہیں ۔نذیر احمد اسلئے ذیادہ اہمیت کے حامل ہیں کہ انھوں نے بیواؤں کی شادی کی اہمیت پر زور دیا۔ اور مسلم معاشرے کے سلگتے ہوئے مسئلے کو حل کرنے کی تلقین کی۔

توہم پرستی:

ہندوستانی معاشرے میں توہم پرستی یا اندھ وشواس ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ توہم پرستی سے مراد وہ رسومات جن کے کرنے سے زندگی میں خوشحالی آسکتی ہے۔ مثلاً ہندو سماج میں نوزائیدہ بچوں کی کنڈلی (ذائچہ) تیار کرنا۔ سیّاروں کی گردش کا انسانی زندگی پر اثرانداز ہونا، شوہر کے مرنے پر بیوہ کا ستی ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔

[1] نذیر احمد ایامی۔ صفحہ ۷۰

ہندوستان کے مسلم معاشرے میں ایسے کئی رسم و رواج وقوع پذیر ہوئے جن کی وجہ سے توہم پرستی ایک اہم مسئلہ بن کر ابھرا۔ ہندو سماج کے کچھ اثرات مسلم سماج پر بھی پڑے ۔جس کی

اصلاح ضروری ہو جاتی ہے۔مثلا شب برات میں حلوہ بنانا، منت، قبروں پر چادر چڑھانا وغیرہ ۔اسی طرح خواب کی تعبیر ڈھونڈنا بھی ایک اہم مسئلہ کہا جا سکتا ہے۔نذیر احمد نے ہمیشہ دوٹوک بات کہی۔حق کے اظہار میں کبھی مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا۔توہم پرستی پر انھوں نے 'رویائے صادقہ' کے عنوان سے ناول لکھی جس میں انھوں نے اپنے مذہبی عقائد کا کھل کر اظہار کیا۔اس ناول کا موضوع ایک لڑکی صادقہ کی زندگی ہے ۔وہ خواب میں جو کچھ دیکھتی ہے اسے پیشن گوئی کے طور پر مانا جاتا ہے۔چونکہ جو خواب بیان کرتی ہے اسی طریقے کے واقعات رونما ہوتے ہیں ۔اسی بناء پر وہ ایک ایسی لڑکی کے طور پر مشہور ہو جاتی ہے جس پر جن بھوت کا سایہ ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی شادی نہیں ہو پاتی۔جبکہ اس کی چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو جاتی ہیں۔ ایک دن اس کے والد کو ایک خط ملتا ہے جو علی گڑھ کے طالب علم سید صادق کا لکھا ہوا ہے۔وہ صادقہ سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔سید صادق مذہبی آدمی ہے لیکن پھر بھی زندگی کے ہر مسئلہ کو عقل کی بنیاد پر حل کرنا چاہتا ہے۔اور جب اس کی عقل جواب دے جاتی ہے۔

تو وہ خدا سے مدد مانگتا ہے۔

صادقہ کا خواب دیکھنا اس ناول کا اصل موضوع ہے اس کا شوہر صادقہ کی حالت سدھارنے کے لئے بہت کوشش کرتا ہے اور جب وہ ہار جاتا ہے تو اس کے منہ سے بے ساختہ کلمات ادا ہوتے ہیں۔

''اے خدا اگر تو واقعی خدا ہے تو جیسا کہ تمام اہل مذاہب تجھ کو مانتے ہیں تو مجھ کو ورطہ حیرت سے نکال اور ہر بات میرے دل میں ڈال دے۔'' [1]

ادھر یہ جملہ پورا ہوتا ہے ادھر صادقہ نیند سے بیدار ہوتی ہے۔ وہ اپنا خواب بیان کرتی ہے کہ ایک بزرگ ہے جو اس کی الجھنوں کو سلجھا رہے ہیں اور اس کے سوالات کا اطمینان بخش جواب دے رہے ہیں۔ وہ بزرگ صادق کی کشمکش شک وشبہات مذہبی عقائد مدلل طریقے سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی مغربی تعلیم کے اثرات نے مسلمانوں کی نوجوان نسل میں جو وسوسے پیدا کر دئے تھے ان سب کو دلیلوں سے رفع کرتے ہیں۔

ان تمام باتوں سے بھٹکا ہوا صادق راہ راست پر آجاتا ہے۔

ڈپٹی نذیز احمد اردو ناول نگاری کے اولین ناول نگار تسلیم کئے جاتے ہیں نذیر احمد کی ناول نگاری سے قبل داستان نویسی کا رواج تھا۔ نذیر احمد نے اس روایت سے انحراف کرتے ہوئے اپنے دور کے سیاسی سماجی اور مذہبی حالات پر غور وفکر کیا۔ اور ایک

[1] ڈپٹی نذیر احمد رویائے صادقہ۔ صفحہ ۷۰

ایسی قوم جو احساس کمتری کا شکار ہوگئی تھی۔ اس میں خود اعتمادی پیدا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی سماجی حالت جس قدر پسماندہ ہوگئی تھی۔ اسے ترقی کی راہ پر لانے کے لئے جہاں سر سیّد احمد خان نے کوشیشیں کی اسی کو آگے بڑھاتے ہوئے نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں بیان کرنے کی کوشش کی ۔ ۱۸۵۷ء کے حالات پر ظ۔ انصاری کا خیال ہے۔

''۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے اس کے پہلے اور اس کے بعد احساس پسماندگی اور شکست مکمل کے جو منفی اثرات اردو ادب میں نظر آتے ہیں وہ اس کا ایک دردناک رُخ ہے لیکن دوسرا رُخ اسی قدر تابناک بھی ہے اس تاریخی واقعات کی جدلیات کا سراغ ملتا ہے جب ہم شعراء اور ادیبوں کی تباہ حالی عام لوگوں کے احساس بے بسی، ادبی مرکزوں کی سرسینگی، کلیات دیوانوں اور تصنیفوں کی تلخی، بے باک اہل قلم کی زباں بندی، قتل، پھانسی اور کالے پانی کی سزاؤں کے ساتھ ادب کے سر پرستوں کے پریشان زندگی کے ان بھت اندھیروں میں نئے تصورات، اصلیت پسندی نئی آگاہی اور نئے قومی ذہن کی بیداری کو اونچے ہوتے دیکھتے ہیں یہ تو آہستہ آہستہ اونچی ہوتی ہے اور اس کی روشنی اس خونی افق سے پھیلی ہے جس میں ہمارے بڑے بڑے روشن ستارے ڈوب گئے۔'' [1]

درج بالا قول کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے دور کے سلگتے ہوئے مسئلوں کو اپنی ناولوں میں بیان کرنے کی جسارت کی ہے۔

[1] اردو ادب ۱۸۵۷ء کے دور میں زبان و بیان ظ۔ انصاری۔ صفحہ ۲۴۵

ــــہ

اختتامیہ

اختتامیہ

اردو ادب کی تاریخ میں ڈپٹی نذیر احمد ایک ناول نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھیں اردو کا پہلا ناول نگار بھی کہا جاتا ہے۔ وہ ایک خوش بیان خطیب ماہر تعلیم اور مترجم تھے اور عربی زبان وادب کے عالم بھی۔ عربی علوم ونظریات کی تبلیغ واشاعت میں نذیر احمد نے سر سید کی اصلاحی تحریک کو آگے بڑھایا۔ لیکن افسانوی ادب کے میدان میں نذیر احمد کے کارناموں کی ایک مستقل حیثیت ہے۔ انھوں نے سات ناول لکھے۔ آج اردو ناول نگاری اپنی تخلیقی دور کی سو سال سے ذیادہ تاریخ مرتب کر چکی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں پر جو کچھ لکھا گیا وہ منتشر اور مختصر شکل میں ملتا ہے نذیر احمد کی ناول نگاری کے فکری اور فنی پہلوؤں کی وضاحت نہیں ملتی اور نہ ہی ان کی شخصیت اور فن کے مطابق ادبی تسلسل پر روشنی پڑتی ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا عہد اور اس دور کا سماج خاص طور سے مسلم معاشرے میں جو مسائل پیدا ہو گئے تھے انکی عکاسی نذیر احمد کی ناولوں میں با آسانی محسوس کی جاسکتی ہے۔ نذیر احمد اپنے دور کے مفکر اور اصلاح معاشرے کے بہترین مبلغ تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے فکری وفنی نظریات کو اپنے ناولوں میں بیان کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔

اس لئے ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں سماجی نقطہ نظر سے جو مسائل بیان کئے گئے ہیں یا مسلم سماج کا جو پہلو نذیر احمد نے بیان کیا ہے اس کا مطالعہ کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔اسی لئے نذیر احمد کی ناولوں کا سماجی مطالعہ کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھنے کی کوشش کی جارہی ہے ۔ جو درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔

چونکہ ادب معاشرے کی عکاسی کا فرض بھی انجام دیتا ہے۔اور اصلاح کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اسی سے سماج و ادب، ایکدوسرے پر اثر انداز دکھائی دیتے ہیں ۔ادب کے تعلق سے یہ خیال ہے کہ ادب وفکر و احساس، اظہار کے تناسب اور حسن کا دوسرا نام ہے ۔جو بات اظہار کے عام طریقوں سے ہٹ کر خوبصورت پیراوں میں کہی جاتی ہے وہ ادب کا خام مواد بن جاتی ہے ۔پھر بیان کا خوبصورت پیرایا اسے ادب کی صورت بخشتا ہے ۔ادب ایک تخلیقی حقیقت ہے وہ انسان کے فکر و احساس اور اسکے تجربات و تاثرات کا ترجمان ہوتا ہے ۔ادب فنکار کی ذات اور اس کے گرد و پیش کے ماحول دونوں کا آئینہ دار ہے ۔اس کی زبان عام بول چال کی زبان سے مختلف اور موثر ہوتی ہے ۔ اس کا ایک نرالا طرز اظہار اور ایک مخصوص اسلوب ہوتا ہے۔ جب تک انسان کے جذبات موجود ہیں ادب کی اہمیت باقی رہے گی۔

لغت میں سماج کے معنی انجمن، معاشرے وغیرہ کے ہیں۔اصلاح عام میں سماج سے مراد ایک خاص جغرافیائی ماحول میں رہنے بسنے والے انسانوں کے گروہ کو کہتے ہیں۔ جو خاص حالات کے تحت یکجا رہائش اختیار کرتے ہیں۔اور اپنی ایک علحدہ سماجی شناخت کے حامل ہوتے ہیں۔سماج مختلف واقعات اور حالات سے متاثر ہوتا ہے۔زمانہ قدیم سے مہذب انسان بننے کا سفر سماجی تاریخ کہلاتی ہے۔انسان اپنے فطری تقاضوں کے زیراثر اپنے آس پاس کے ماحول کے ذریعہ ایک مخصوص فضاء میں پرورش پاتا ہے۔وہ اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں، تصور اور تخیل کی نئی نئی دنیا تلاش کرتا رہتا ہے۔اس کی تمام دلچسپیوں اور صلاحیتوں میں فن لطیف انسانی زندگی کا سب سے بہترین کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔مصوری رقص ہو یا ادب انسان کے نازک ترین احساسات و جذبات کا حصہ ہیں۔ مذکورہ صلاحیتوں میں سے کوئی بھی شئے ایسی نہیں جس کا تعلق سماج سے نہ ہو خاص طور سے شعروادب کی دنیا انسانی ذہن کے وسیلے سے سماج، معاشرہ، تہذیب اور سیاست کے مختلف پہلوؤں کو اپنے فن پارے کا موضوع بناتا رہتا ہے۔اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ادب ایک طرح ہماری زندگی کا آئینہ بھی ہے اور ہماری تہذیب وتمدن کا عکس بھی۔ ہماری زندگی جن حالات سے نبرد آزما ہوگی بالکل اسی طرح کا ادب بھی تخلیق ہوتا رہے گا۔اس لئے ادب وسماج کا رشتہ لازم وملزوم کہا جاسکتا ہے۔

ادیب چونکہ معاشرے کا پروردہ ہوتا ہے اسکی شخصیت فکروسوچ پر سماجی حالات، واقعات اور وسائل کا اثر پڑتا ہے۔اسی بات کے مدنظر ڈپٹی نظیر احمد کی ناولوں میں سماجی عوامل نے اثرات مرتب کئے اس کی تحقیق ضروری ہوجاتی ہے۔

ناول اردو کی ترقی یافتہ صنف ہے جس میں انسانی زندگی کی گونا گوں رنگوں کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ ناول میں انسانی زندگی کے سچے واقعات کا بیان کچھ اس انداز میں کیا جاسکتا ہے کہ قاری کو اس میں اپنے آپ یا آس پاس کے ماحول کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہے۔ یوں تو کہانی سننا اور سنانا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ کہا جاتا ہیکہ جب انسان نے دنیا میں قدم رکھا تبھی سے کہانی کی ابتداء ہوگئی۔ بعد میں مبالغہ کی ملاوٹ نے داستان کو جنم دیا۔ زمانہ جوں جوں ترقی کرتا گیا داستان کی اہمیت کم ہوئی اور صنعتی دور میں مصروفیت میں اضافہ کی وجہ سے حقیقی زندگی کی ترجمانی صنفِ ادب 'ناول' کا جنم ہوا۔

ناول یہ لفظ اطالوی زبان کے لفظ 'ناولا' سے بنا۔ انگریزی ادب نے اسے ناول کا نام دیا۔ اردو میں یہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اردو ناول کا آغاز ڈپٹی نذیر احمد کے ہاتھوں ہوا۔ انھوں نے اپنی لڑکیوں کی اخلاقی تعلیم کے لئے حقیقی زندگی سے مختلف واقعات کو چن کر قصّے لکھے۔ نظیر احمد سے پہلے ناول کا تصور نہیں ملتا اسی لئے ناول کی فنی ترتیب وتزئین انگریزی ناول کے مقابلے میں کم نظر آتی ہے۔ نذیر احمد کے بعد پنڈت رتن ناتھ سرشار نے ناول نگاری کو آگے بڑھایا۔ ان کے ناولوں میں لکھنو کی معاشرت اور طرز زندگی کی تصویر کشی ملتی ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کے بعد عبدالحلیم شؔرر نے تاریخی ناول تخلیق کئے۔ اور نئی روشی کا آغاز کیا۔

انھوں نے اسلام کے شاندار ماضی کو موضوع بنایا اور مسلمانوں کو راہ مستقیم پر چلنے کی تلقین کی۔ان کے ناولوں میں قومی اتحاد بھائی چارگی اور انسان دوستی کا درس ملتا ہے۔

اسکے بعد راشد الخیری، منشی سجاد حسین اور محمد علی طیب نے فن ناول نگاری کو فوقیت بخشی دھیرے دھیرے ناول کا فن اپنے عروج کی سمت گامزن رہا۔اور ایک اہم نام ہادی رسواء سامنے آیا جس نے امراؤ جان اور خواب ہستی، ہیرے کی کنی جیسے ناول دیئے۔رسواء کی ناولوں میں نفسیاتی اور تجزیاتی پہلوؤں کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔۱۹ویں صدی آتے آتے اردو میں کئی ناول نگار سامنے آئے اور ۲۰ویں صدی کی ابتداء میں پریم چند، سدرشن، قاضی عبدالغفار، مجنو گورکھپوری ، نیاز فتح پوری، ل۔احمد وغیرہ جیسے ناول نگاروں نے اپنے دور کے مسائل کو حالات اور نزاکت کی روشنی میں پیش کیا۔

۱۹۳۶ء کے آس پاس انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک حلقہ قائم ہوا جس میں سجاد ظہیر، عصمت چغتائی، عزیز احمد، کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر نے ترقی پسند ناول نگاری کو پروان چڑھایا۔ان ادیبوں نے مارکس ازم یا اشتراکیت اور موجودہ سائنس اور سماجی علوم کی روشنی میں اپنے ناولوں کو تخلیق کیا۔

راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عزیز احمد وغیرہ نے ترقی پسند ادب کے ساتھ ساتھ جنگ آزادی کو بھی موضوع بنایا۔

۱۹۴۷ء کے سانحہ پر کئی ناول نگاروں نے اپنے شاہکار ناول لکھے۔ جس میں تقسیم ہند سے پیدا شدہ مسائل شامل ہیں۔ خاص طور سے بنجامن گیلانی کی ناول، تمس ابراہیم جلیس کی ناول، دوملک ایک کہانی، کرشن چندر کی لاہورا یکسپریس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں سیاسی، اقتصادی، سماجی و معاشی بدحالی، ناانصافی وغیرہ جیسے موضوعات پر بے شمار ناول لکھے گئے۔ ان ناول نگاروں میں مظہرالزماں، فہمیدہ ریاض، احمد داود، آغاز سہیل، محمد حسن، الیاس احمد گدی، غضنفر، گیان سنگھ شاطر، احمد صغیر، وبھوتی نارائن، شام سندر آنند وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہماری بکھری ہوئی تہذیب و اقدار سے متعلق کئی ناول نگاروں نے اپنی تخلیقات پیش کئے۔ ان میں مشرف عالم ذوقی، جوگندر پال، پیام آفاقی وغیرہ شامل ہیں۔

درجہ بالا تمام ناول نگار اردو ناول نگاری کے ارتقاء و توسیع کے اہم تخلیق کار کہے جا سکتے ہیں۔ دور حاضر میں مراٹھواڑہ سے دو اہم ناول بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔

۱) خوابیدہ ایوانوں کے چراغ۔ ۲) چاند ہم سے باتیں کرتا ہے ان دونوں ناولوں کے ناول نگار نورالحسنین ہیں اس لحاظ سے ناول نگاری کے میدان میں نئے نئے شہسوار اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ناول نگاری کو فروغ دے رہے ہیں۔

اردو میں ناول نگاری کو متعارف کروانے والے فن کار ڈپٹی نذیر احمد ہی ہیں۔انھوں نے کل سات ناول لکھے ان ناولوں میں انھوں نے اپنی زندگی کے تجربوں، نظریوں اور اصلاحی اعمال وافکار بیان کئے ہیں۔ان کی ناولوں میں مراۃُ العرُوس، بنات ُالنعش، توبتہُ النصوح، فسانہءمبتلا، ابن الوقت، ایامی اوررویائے صادقہ شامل ہیں۔انھوں نے اپنی ناولوں میں نیک نیتی، خلوص، ہمت وشدت احساس سے کام لیا۔

مراۃُ العرُوس، ان کا پہلا ناول ہے۔اس ناول میں انھوں نے اپنی کردار نگاری، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری سے اس دور کے حالات کا جائزہ لیا ہے۔اس ناول کا موضوع امور خانہ داری ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا دوسرا ناول بنات النعش ہے جو ۱۸۷۳ء میں منظر عام پر آیا۔اس ناول میں انھوں نے مغربی تعلیم وطرز زندگی کے نقصانات کو بیان کیا۔ساتھ ہی انھوں نے خواتین کیلئے بہترین معاشرتی زندگی کے گر بھی سکھائے۔تعلیم کی اہمیت کو بیان کیا، نئے علوم سیکھنے کی تلقین کی خاص طور سے سائنسی مضامین جس میں زمین کی کشش، ہوا کا دباو، آفتاب کے گردش کرنے کا نظریہ جغرافیائی معلومات کے ساتھ جنرل نالج پر بھی زور دیا۔

’توبۃ النصوح‘ ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی۔ڈپٹی نذیر احمد نے اس میں اولاد کی تربیت کے متعلق مسئلہ اٹھایا۔مذہب تہذیب وتمدن اور نئے معاشرے میں نوجوانوں کی دلچسپی سے پیدا ہونے والے مختلف مسائل بیان کئے۔

'فسانہءمبتلا' نذیراحمد کا چوتھا ناول ہے۔۱۸۸۵ء میں منظرعام پرآیا۔اس ناول میں ایک سے ذیادہ شادیاں کرنے کے مسئلے کو معاشرے کیلئے خرابیاں پیدا کرنے کی جڑ مانا گیا ہے ۔ساتھ ہی کم عمری میں شادیوں کے رواج کو بند کرنے کی تلقین کی ۔وہ اپنے کرداروں کے ذریعے اپنی بات سادہ زبان میں اپنے قاری تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔

'ابن الوقت' ان کا پانچواں ناول ہے۔اس ناول کومقبول ترین ناول کہا جا سکتا ہے ۔اس کی اشاعت ۱۸۸۸ء ہوئی ۔اس ناول میں دکھایا گیا ہے کہ دوسروں کی نقل کرنے والا ناکام اور پشیمان ہوتا ہے۔ابن الوقت نے انگریزوں کی نقالی کی تو اسے نہ ہی انگریزوں نے پسند کیا اور نہ ہی اس کی قوم نے۔کہا جاسکتا ہے کہ ابن الوقت ناول حجتہ الاسلام کا کردار خود نذیراحمد کا ہے۔جبکہ ابن الوقت کا کردار سرسیّد احمد خان کا ہے۔ابن الوقت انگریزوں سے مل کر مسلمانوں کے لئے اصلاحی پروگرام چلاتا ہے۔انگریزوں سے ہمدردی رکھتا ہے۔انگریزی تعلیم کا دلدارہ ہے اور مسلمانوں کو سزاوں سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے ۔اسلامی احکامات کی نئ نئ تعاویلات پیش کرتا ہے۔اس کے برخلاف حجت الاسلام قرآنی اقداراوراسلامی نقطہ نظر سے نئ نسل کو انگریزی تعلیم سے دور رہنے کی اور انگریزی تہذیب وتمدن کو نہ اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔اس ناول کا پلاٹ ابن الوقت اور حجت الاسلام کی تقریروں میں الجھ کر رہے گیا۔

'ایامیٰ' ڈپٹی نذیر احمد کا چھٹا ناول ہے۔اس ناول کو زیادہ شہرت نہ ملی اس میں ایک بیوہ کی المناک داستان بیان کی گئی ہے۔ایامی دراصل عربی زبان کا لفظ ہےجس کے معنی زن بے مرد کے یعنی ایسی عورت جس کا مرد نہیں ہے۔ نذیر احمد نے تلخ حقیقت نگاری سے کام لیا اور عورتوں کی تہذیب کے رسومات جو ایکدوسرے پر جزوی طور پر اثر انداز تھےان کو بیان کیا۔

'رویائے صادقہ' نذیر احمد کا ساتواں ناول ہے۔اس کی اشاعت ۱۸۹۴ء میں ہوئی۔اس ناول کا مرکزی کردار صادقہ ہے جو بچپن سے ہی جو خواب دیکھتی ہے وہ سچ ثابت ہوتا ہے۔دراصل یہ ناول توہم پرستی کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔یہ بات مشہور ہوجاتی ہیکہ صادقہ پر جن یا بھوت کا اثر ہے جو اسے خواب میں ہونے والے واقعات کی تصویر بتا دیتا ہے۔اس لئے اس کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے۔کوئی اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا،علی گڑھ کا ایک طالب علم اس سے شادی کرتا ہے لیکن وہ بھی پریشان رہتا ہے۔آخر کار وہ خدا سے رجوع ہوتا ہے۔اور صادقہ کے لئے دعا مانگتا ہے۔ادھر وہ دعا مانگتا ہے ادھر صادقہ وجدانی صلاحیتوں کی وجہ سے محسوس کر لیتی ہے کہ ایک بزرگ اس کی الجھنوں کو سلجھا رہے ہیں اور اس کے سوالات کا تشفی بخش جواب دے رہے ہیں ۔صادقہ کا یہی خواب دراصل ناول کا موضوع ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسان سماجی جانور ہے۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آج بھی اس کی معنویت، اہمیت وافادیت مسلم ہے۔

کیونکہ انسان کو سماج میں زندگی گزارنا پڑتا ہے، اس کی سوچ وفکر سماج میں ہی پروان چڑھتی ہے۔ادیب یا شاعر سماج اور معاشرے کے اصول وضوابط اور مختلف مسائل سے گزرتے ہوئے اپنی تخلیقات کو پروان چڑھاتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد بھی اپنے دور کی پیداوار کہے جاسکتے ہیں۔ان کا دور ۱۸۵۷ء کے بعد سے ۱۹۱۲ء تک کا دور کہا جاسکتا ہے۔۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا عکس ہم ان کی ناولوں میں محسوس کرسکتے ہیں۔غدر کی وجہ سے مسلمان جو کہ حاکم قوم تھی محکوم بن گئی اور مختلف مصیبتوں اور پریشانیوں میں گھر گئی۔اس دور کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اقتدار پر قائم افراد نے ابتداء میں ظلم وزیادتیوں کے ذریعے مفتوح قوم کو کچلنے کی کوشش کی اور پھر معاملہ فہمی کے ذریعے سماجی طبقات میں اصلاحات کرنے کی کوشش بھی کی۔

ڈپٹی نذیر احمد کے دور میں مسلم سماج جن مسائل سے گھرا ہوا تھا اسی کو ڈپٹی نذیر احمد نے محسوس کیا جو درج ذیل ہے۔

تعلیم کی کمی، انگریزی تعلیم سے فرار کا رویہ، نئی انگریزی تہذیب کے اثرات، توہم پرستی، عورتوں کے تعلیم کے مسائل، ایک سے زائد شادیوں کا رواج، گھریلو مسائل، مذہبی امور میں بحث ومباحثہ، قدیم رسم ورواج سے وابستگی جیسے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں پھیلی ہوئی برائیوں کا مسلم معاشرہ شکار تھا۔ڈپٹی نذیر احمد نے سماج میں پھیلے ہوئے انہیں نقائص کو اپنی ناولوں کا موضوع بنایا۔اور اپنے سماج میں اس کی اصلاحات پر زور دیا۔

بنایا۔اوراپنے سماج میں اس کی اصلاحات پر زور دیا۔کہا جاسکتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد کے ساتوں
ناول سماجی و معاشرتی پہلوؤں کی اصلاح کے لئے لکھے گئے ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلم سماج کو
احساس کمتری سے باہر نکالنا اوران میں خوداعتمادی پیدا کرنا اس دور کے تعلیم یافتہ افراد کے ذمہ تھا
۔چنانچہ سرسیّداحمد خان، شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی اور ڈپٹی نذیراحمد نے اس دور کے سماج میں
بیداری اور ملی مسائل کو لوگوں کے سامنے رکھا۔قومی بیداری پیدا کرنے کیلئے اپنے اپنے طور پر
کوشش کرنے لگے۔ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں نے سماج کے ایک مخصوص طبقے کو متاثر کیا اور وہ
طبقہ تھا ’طبقہ نسواں‘ یا عورتوں کا طبقہ۔

کہا جاسکتا ہے کہ عورتوں کے مسائل کی وجہ سے مسلم سماج میں کئی طرح کی خامیاں پائی
جاتی تھیں ۔انھیں دور کرتے ہوئے سماج کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا گیا تھا۔نذیر احمد یہ محسوس کرتے
تھے کہ مسلمانوں میں نئی نسل کی تربیت اور اسلامی نکتہ نظر سے ایک صالح معاشرہ اسی وقت وجود
آسکتا ہے جب عورتوں کی تعلیم پر زور دیا جائے گا۔

نذیر احمد کے ناولوں میں عورتوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ سماج میں پھیلی ہوئی
ناخواندگی ، بے روزگاری اور بے حسی کے ساتھ دینی و دنیاوی مسائل پر فضول بحث ومباحثہ ،
انگریزوں کی تہذیب کی نقالی اور روایتی اقدار سے دوری کو موضوع بنایا گیا ہے۔انہی مسائل کے
گرداس دور کا سماج گھرا ہوا تھا۔ مایوسی ، بے بسی ،قناعت پسندی اور تقدیر کے سہارے لوگ
زندگی گزار رہے تھے۔سماج کی اس کیفیت کو نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں بیان کرکے اس دور
کے سماج کی حقیقی عکاسی کی ہے۔

ڈپٹی نذیراحمد کے ناولوں میں سماج کے ایک اہم حصے یعنی عورتوں کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔عورتوں کی زندگی سے متعلق اصلاح اوران کی زندگی خوشحال بنانے کے تمام تر پہلو محسوس کئے جاسکتے ہیں۔نذیراحمد کے ناولوں میں مسلم خاندان کی خواتین تھیں جو متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی تھی۔جو تعلیم وتہذیب سے بے نیاز تھیں۔ان کے اخلاق و عادات سنجیدگی و متانت اعلی طبقوں کی عورتوں سے مختلف تھی۔ڈپٹی نذیراحمد کو مسلم عورتوں کے اخلاقی اور معاشرتی حالات کا اندازہ تھا اسی لئے انھوں نے مراۃُ العرُوس ، بناتُ النعش ناول میں لڑکے اورلڑکیوں کی تعلیم کو رائج کرنے پرزوردیا۔کیونکہ معاشرے میں تہذیب واخلاق کے متعلق کتابیں نایاب تھیں۔ڈپٹی نذیراحمد یہ مانتے تھے کہ قوم میں اصلاح اسی وقت ہوسکتی ہے جب عورتوں میں تہذیب واخلاق کی اصلاح کی جائے۔عورتوں کا ایک مسئلہ امورخانہ داری تھا۔امورخانہ داری میں حسن سلوک، عادات واطوار کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔انھوں نے اکبری اوراصغری کردار کے ذریعے سے بیان کرنے کی کوشش کی۔اصغری میں صالح اخلاق ہیں وہ اپنے اخلاق و عادات کے ذریعے سسرال والوں کوخوش رکھتی ہے۔اکبری اس کے برعکس ہے جس کی وجہ سے اس نے اپنے سسرال کوجہنم بنالیا تھا۔توبتہ النصوح میں بھی انھوں نے بیوی بچوں سے لاپرواہی کوموضوع بنایا۔

اور اولاد کے تربیت سے لا پرواہی کس حد تک معاشرے کو بگاڑ سکتی ہے اسے بیان کیا۔ فسانہ مبتلا میں ایک اہم سماجی مسئلہ ایک سے ذائد شادی کرنا اسکو موضوع بنایا۔ دینی مسائل کے ذریعے تعداد ازدواج یا بیویوں کی

کی تعداد کے ساتھ نکاح و خلاع کے مسئلوں کو اہمیت دی۔ ایامی ناول میں انھوں نے مسلم سماج میں پائی جانے والی خود ساختہ مذہبی رسومات کو موضوع بنایا۔ خاص طور سے بیوہ عورتوں کی زندگی میں پیش آنے والے المناک واقعات ان سے غیر انسانی کیا جانے والا سلوک اور بیواؤں کی دوسری شادی کرنا جیسے مسائل کو اجاگر کیا ہے نذیر احمد یہ مانتے تھے کہ بیوہ عورتوں کو سماج میں دوسری شادی کا حق ملنا چاہئے۔

'رویائے صادقہ' میں انھوں نے توہم پرستی کو موضوع بنایا اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے پہلوؤں پر بحث کی۔

مسلمان گھرانوں میں پردوں کا رواج عورت کی حیثیت شرم و حیاء کی تعریف وغیرہ پر اظہار خیال کیا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کو پڑھنے کے بعد جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں

۱) ڈپٹی نذیر احمد اپنے دور کے سماجی مسائل سے پوری طرح واقف تھے۔

۲) لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے کوشاں تھے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں مسلمان شرفاء کی خاندانی زندگی، امور خانہ داری، حسن معاشرت، تہذیب و تمدن کی تصویر کشی کی ہے۔

۳) لڑکیوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ امور خانہ داری اور عام معلومات میں اضافہ کرنے کو اور اس کی اہمیت جتانے کیلئے کوششیں کی ہیں۔

۴) نذیر احمد نے اپنی ناول توبۃ النصوح کے ذریعے اولاد کی تربیت اور صحیح اسلامی زندگی کو پیش کیا۔

۵) 'فسانہ مبتلا' میں ایک سے زائد بیویوں کی بناء پر پیدا ہونے والی سماجی برائیوں اور ناقص تعلیم و تربیت کو موضوع بنایا۔

۶) 'ابن الوقت' ناول میں انھوں نے مشرق و مغرب کی تہذیب کا موازنہ کیا اور انگریزوں کی اندھی تخلیق کو طنز کا نشانہ بنایا۔

۷) 'ایاّمیٰ' ناول میں انھوں نے بیوہ عورتوں کے دوبارہ نکاح کی ترغیب دی۔ رویائے صادقہ میں شریفوں کی زندگی کے متعلق حالات و عقائد کو درست کرنے کا مشورہ دیا۔ بحیثیت مجموعی کہا جا سکتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے دور میں مسلم معاشرے یا سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے اور صالح مسلم سماج بنانے کیلئے کوششیں کرتے رہے۔

اس تحقیقی مقالے کی تیاری میں جن کتابوں و رسائل سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے اس کی فہرست دی گئی ہے۔

فہرست کتب

۱) ایم۔ایم گپتا ۔ سماج شاستر۔

۲) احتشام حسین ۔ ادب وسماج

۳) احتشام حسین ۔ ذوق ادب وشعور۔

۴) پروفیسر سیّدہ جعفر ۔ تاریخ ادب، اردو عہد، میر سے ترقی پسند تحریک تک۔جلد چہارم۔

۵) پروفیسر صغیرہ فراہیم ۔ اردو کا افسانوی ادب۔

۶) پروفیسر مجیب ۔ تاریخ تمدن۔

۷) ڈاکٹر امر رئیس ۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ۔

۸) ڈاکٹر محمد ایمن انصاری ۔ اردو ناول میں سماجی مسائل۔

۹) ڈاکٹر حمید سہروردی ۔ بین السطور۔

۱۰) ڈاکٹر اشفاق محمد خان ۔ نذیر احمد کے ناول کا تنقیدی مطالعہ

۱۱) ڈپٹی نذیر احمد ۔ مراۃ العُروس۔

۱۲) ڈپٹی نذیر احمد ۔ بنات النعش۔

۱۳) ڈپٹی نذیر احمد ۔ توبتہ النصوح۔

۱۴) ڈپٹی نذیر احمد ۔ فسانہ ءمبتلا۔

۱۵) ڈپٹی نذیر احمد ۔ ابن الوقت۔

۱۶) ڈپٹی نذیر احمد ۔ ایامی۔

۱۷) ڈپٹی نذیر احمد ۔ رویائے صادقہ۔

۱۸) سلیم احمد ۔ مقدمہ ڈپٹی نذیر احمد۔

۱۹) سرسیّد احمد خان ۔ اصلاح معاشرہ۔

۲۰) سرسیّد احمد خان ۔ آخری مضامین۔

۲۱) شہناز نبی ۔ تانیصیت کے مُباحث اور اردو ناول۔

۲۲) صدیقی ممتاز جہاں ۔ آزادی سے قبل اردو نظم کا سماجیاتی مطالعہ۔

۲۳) طاہرہ بنارسی ۔ ڈپٹی نذیر احمد فن اور شخصیت کے چند پہلو۔

۲۴) عصمت چغتائی ۔ تیڑھی لکیریں۔

۲۵) علی عباس حسینی ۔ اردو ناول کی تاریخ وتنقید۔

۲۶) قراۃ العین حیدر ۔ آگ کا دریا۔

۲۷) کرشن چندر ۔ ناول شکست۔

۲۸) منتظر عباس ۔ اردو ناول کا سفر۔

۲۹) مہیندر ناتھ ۔ ناول ۔ ریت اور گناہ۔

۳۰) نورالحسن نقوی ۔ تاریخ ادب اردو۔

۳۱) وقار عظیم ۔ داستان سے افسانے تک ۔

۳۲) یوسف سرمد ۔ بیسویں صدی میں اردو ناول۔

فہرست رسائل

۱) اردو دنیا

۲) انشاء

۳) ایوان اردو

۴) آج کل

۵) آگہی

۶) توازن

۷) سب رس

۸) شاعر

۹) فکر و تحقیق

۱۰) فکر و فن

۱۱) قرطاس